

منی لائبریری

لکھنؤ

افسانے

راجندر سنگھ بیدی

15/00

نیا دارہ

خالد کاظم

افسانے

لمبی لڑکی

راجندر سنگھ بیدی



نیا ادارہ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار اول : ۱۹۶۶ء

ناشر : نذیر احمد چودھری

نیا ادارہ - لاہور

مطبع : سویرا آرٹ پریس لاہور

ترتیب

۵	لمبی لڑکی
۶۲	دیوالہ
۹۸	صرف ایک سگریٹ
۱۴۹	سرب دیال

راجندر سنگھ بیدی

گمبھن	(افسانے)
دانہ و دام	(افسانے)
ایک چادر میلی سی	(ناول)
کوکھ جلی	(افسانے)
لاجوتی	(افسانے)
اپنے دکھ مجھے دے دو	(افسانے)
مکتی بودھ	(افسانے)

لمبی لڑکی

آخر جب منی سوہی پانچ فٹ آٹھ انچ کی ہو گئی تو دادی رمن نے
اپنا سر چیٹ لیا۔

”دارے! میں تیرے لئے کہاں سے گھڑا کے لاؤں گی؟“ وہ اپنے
ڈھائی بال نوچتے ہوئے بولی اور اب کے سچ سج روتی ہوئی وہ اپنے
ڈھیلے ڈھالے بوڑھے اور بیمار پلنگ میں پیچھے کی طرف یوں جا رہی
جیسے کلٹر سے پانی چھلکتا کوکچی زمین میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔
منی سوہی کیا جواب دیتی؟ اس نے پہلے اپنی طرف دیکھا اور پھر
بے لہی میں دادی رمن کی طرف، جیسے وہ کہہ رہی تھی: اس میں میرا
کیا قصور؟ منی تو اپنی لمبان سے آپ ہی شرمندہ تھی، جیسے جراتی کی
ناگانی یورش کے بعد ہر کنواری گھبرا اٹھی ہے۔ کوئی پوچھے جب پیٹر
پرنسپل لگتے، بکتے ہیں تو کیا پیٹر گھبرانے، شرمانے لگتا ہے؟
پلنگ کے پاس اخروٹ کی ایک تپائی رکھی تھی جس پر عقیدت کے

رنگوں سے کڑھا ہوا ایڑٹیکس کا ایک کپڑا پڑا تھا اور اس کے اوپر
 پانڈوؤں کے زمانے کی، پرانے چھاپے کی ایک گیتا جس کے پنے
 کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ گیتا ہمیشہ دادی کے مرنے
 پڑی رہتی۔ ماں، دادی کا کیا پتا؟ اب ہوتب نہ ہوا بیاسی برس کی عمر
 تھی اس کی اور جہاں گھر اور اس نیلی محلے کے لوگوں کی بے اسی طہیتی
 جا رہی تھی دادی ماں کی امیدیں جوان ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں تو
 کم سے کم انسا ہی اور۔۔۔ بیاسی سال اور۔۔۔ جینا چاہتی تھی، جیسے
 ابھی کوئی سوا ونہیں آیا، آیا بے تو ابھی آیا ہے۔ اس کی دھندلی نگہ
 بے چین آنکھیں نہ معلوم اور کس وجہ گھٹنا کو ڈھونڈتی تھیں؟ منہ
 کس ذائقے چٹخائے کی تلاش میں تھا؟ اس کا چہرہ پیڑ پر سے گویا
 ہوئے پیل کے پتے کی طرح تھا جس میں رگوں اور ریشموں کا ایک
 جال سا نظر آتا تھا، ہر پانی کہیں نام کو نہ تھی۔

دادی رشتہ کی ہر بابی کہیں نہ کہیں ضرور اٹکی ہوئی تھی۔ دوسرے
 شے سے وہ کھانسی، ہوا سے ہوا ہی میں ہوائی تھیلیاں بھرتی، انفا میں
 چھوہا میں چھوڑتی ہوئی بے دم، بے سدھ ہو کر پیچھے کی طرف لڑھک
 جاتی، ہانکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف سمٹتی ہوئی وہ دم دوار کو دیکھنے
 لگتیں، پرانے پانچ چکروں میں سے نکل کر چھٹے میں چلے آتے، لگے کا

گھٹا گھٹا دیکھنے لگا۔ بھابی شیلہ پیٹی کوٹھی میں بھاگی آئی، دادی کو
 آخری سوا سول میں دیکھ کر آنکھیں پھیل گئی، چلائی نہ "ہائے" کوئی
 ان کو خبر نہ۔ "منی سوہی دڈرتی۔ ردتی، پکار تی ہوئی نہ" باپو کہاں
 ہو؟ دادی گئی، اور دادی سے لپٹ جاتی "دادی، میں بے مال
 کی بیٹی۔ تجھے چھوڑ نہ جانا...."

اور پھر بھابی شیلہ اور منی سوہی مل کر گیتا کے سترہویں ادھیائے
 کا پانچواں شروع کو دیتیں۔ سماپتی کے بعد اس کا پہل دادی کے منت دینے
 لگتی تارک دادی کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ایک تو دلیہ ہی موت
 کے وجود کا احساس کمزور آوازوں میں ڈرنا، کانپنا، ہوا تر غم — پوری رضا
 میں ایک ڈراؤنی، گھٹاؤنی سی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ پھر ایک ابھی کوئی
 سنو نہ، جس سے گھبرا کر منی پکار اٹھتی "دادی سی سی سی سی" اور
 اس کی آواز چو کوٹ گونج جاتی۔ جیسی بھابی بڑھیا کے بھاگ پین مٹھے
 کمر بین ہاتھ اور چتر بین شریر پر ہاتھ دڑاتے ہوئے کہتی "گئی؟"
 اور پھر "ارے کوئی نیچے اتار دے دیا کر۔ بے گئی مر گئی تو خیر چاکون کرے
 گا؟ کون پنڈتوں کو روپے پوجے گا؟ سترہ روپے نو آنے تو خالی یہاں
 سے ہر دو ار کا کر رہے...."

اور دادی کو یوں گھسیٹ کر پلنگ پر سے نیچے پھینکا جاتا۔

جیسے میلے غلات کو سرمائے سے اتار کر دھلائی میں پھینکتے ہیں اسے
 زمین پر ڈالتے ہی مٹی سوہی رسوئی کی طرف لپک جاتی پور تھوڑی دیر
 کے بعد آٹے کا دیا، دیے میں گھی، اور گھی میں رسی بسلی روٹی کی بتی
 اور ماتھے میں مچھلی لٹے آتی۔ گھبراہٹ اور ہوائیں جلد ہی جلد ہی
 دوچار تیلیاں پھونکتی ہوئی دیا جلاتی، داوی کو روشنی دکھاتی تاکہ
 بھنور کھپا میں بھی جائے تو ٹھوکر نہ کھائے۔ ماتھے پر دیا رکھنے کے بعد
 مٹی ڈری سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو کر بھابی کی آواز میں آواز
 ملاتے ہوئے ”ہری اوم، ہری اوم“ کا جاپ کرنے لگتی اور پھر
 گائتھری کا سہارا لیتی: ”اوم بھور بھوہ سواہ“ جب شبیلا بھابی کو
 یقین ہو جاتا بڑھیا کے سواں نکل چکے ہیں تو وہ زبردستی کے آنسو
 بہانے لگتی۔ ماں، مٹی کے آنسو سچے موتی ہوتے۔ دادی کے سوا اس
 کا سہارا تھا کون؟ ماں گئی، اب دادی بھی گئی تو اس کی پریت پون
 کرے گا؟ اس کے اس جھوٹ کی گواہی کون دے گا جو ہر عورت
 ہر کمزور مرد کو بولنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اس کے الہڑے سے تریا پڑے تہ پر
 کون پرے ڈالے گا؟ شاوی تو ہو گی نہیں۔ کون لڑکا دیکھنے کے
 لئے گلی محلے کے ہر آتے جاتے کے پیچھے پڑے گا؟ پھر اتنا لمبا لڑکا ملے
 گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کہ فی بیبا ہے گا نہیں، بیبا ہے گا تو

لسائے گاہیں۔ مگر دادی رہے گی بھی تو کب تک؟ اس سنسار کے
 بھوسا گر کی تو کوئی تنہا ہی نہیں، کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں۔ کون
 انگلی پکڑے گا؟ کون پار کرائے گا؟

دیوبھیا میں تو اپنی ہی موج، اپنی ہی بہار میں رہتے ہیں۔ سنتے
 ہیں یہاں سے دوتین بازار پر سے اکرم ردو والے اسپتال میں کوئی
 نرس ہے، اس کے ساتھ رات جاگتے ہیں۔ پہلے تو گھر آتے ہی نہیں
 آتے بھی ہیں تو منہ سے، شراب سے بھبھکا کے چھوٹ رہے ہیں کچھ
 شراب کے، کچھ نرس کے۔ یوں بھیا کو نشہ کم ہوتا ہے پر یہ ثابت کرتے
 ہیں کہ انہوں نے نشہ کیا ہی نہیں۔ پکڑے جاتے ہیں۔ ماں، بن بیسے
 بھلا کون ہے جو یوں دھیرے دھیرے، ٹکا ٹکا کر پیر زمین پر رکھتا
 ہے؟ آدمی آدمی ہوتا ہے، کوئی مور تو نہیں۔ پھر نہ زیادہ سنتے ہیں نہ
 خفا ہوتے ہیں۔ آخر بھابی سے جنگ ہوتی ہے۔ وہ اسے تل کے چونچے
 میں پٹخ دیتے ہیں، وہ چھوٹے برتنوں میں بے کالسی کا طبق اٹھا
 کر ان کے سر پر دے دیتی ہے۔ وہ سوال میں مار تے ہیں یہ جواب
 میں دانتوں سے کاٹتی، ناخنوں سے نوچتی ہے۔ جانے یہ عورت مرد
 کا ناظر ہی مار پیٹ کا ہے۔

پھر برتن گلی میں پھینکے جاتے ہیں جو برتن نہیں رہتے ایک طرح

کابینو تاجن جاتے ہیں۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے — گلی کے سب افراد
 اس گھر میں آدھکٹے ہیں؛ بڑی بڑی نصیحتیں، بڑے بڑے بھاشن
 دیتے ہیں؛ لڑائی کیا چکاتے ہیں اور جھگڑا بڑھاتے ہیں۔ بھلا لڑائی
 چکلنے میں کوئی اپنی آستینیں بھی چڑھاتا ہے؟ اندر سے وہ کتنے خوش
 ہوتے ہیں۔ یہ آپ بھی نہیں جانتے۔ پھر کپڑے پھاڑے جاتے ہیں۔
 پہلے تو بھابی بے پردہ ہو جانے کے ڈر سے مار مانتی ہوئی اندر بھاگ
 جاتی تھی پر ایک دن ایسا آیا کہ وہ سب کے سامنے کھڑی تھی —
 نکلی! اس پر دونوں ہاتھ کوہوں پر رکھے ہوئے مجسٹریٹ کی طرح
 ہے رام! ایک پہراؤ بھگوان دیا ہے دوسرا انسان۔ انسانوں میں
 رہنا ہے تو ان کا پہراؤ پہننا ہی پڑے گا، اور بھابی انسان میں
 بھگوان کا پہراؤ اپنے کھڑی تھی! پڑوس میں جینیوں کے دفاندان
 ہیں، شوتیا میر جین اور ڈگامبر۔ اس دن شوتیا مبروں کی دونوں بہویں
 آئی تھیں اور شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بار بار اپنے منہ دھوتی
 کے پلو سے ڈھک رہی تھیں۔ ان تک بات رہتی تو کوئی بات نہ
 تھی۔ ڈگامبروں کے سوکھ منی بھی وہیں تھے جو بھابی کے اس رعب
 داب کو دیکھ کر بھاگے۔ لوگ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں نا!
 سوکھ منی پاؤں پر سر رکھ کر بھاگے، دردازے کی دہلیز کے ساتھ

ٹکڑے، پھر ٹوٹ کے آئے، پھر گئے اور سو گئے۔ کپڑوں، مکڑوں سے راستہ صاف کرنے والے ان کا ہمارو بھی وہیں رہ گیا، ناک کا کپڑا بھی گر گیا۔ نہ معلوم کتنے جیو جنٹو ان کے پاؤں تلے آکر ہنسا ہو گئے ہوں گے اور کتنے ناک کے راستے اندر چلے گئے ہوں گے۔ بھابی کو کتنا پاپ لگا ہو گا! جب سارے جھگڑے بھول کر دیو بھیا اس پروری پھینکتے، گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

یہی بھابی پہلے بات، بات پر مائی کے کی دھمکی دیا کرتی تھی جھوٹ سے لہنگا سنبھالنی، اکا سنگوانی اور چل دیتی۔ پرانت میں وہ سمجھ گئی۔ اب اکا نہیں دھکا بھی ملے تو وہ نہیں جاتی۔ کیوں جاٹے؟ گھر عورت کا ہوتا ہے۔ مرو مسافر اس بات کو کیا جانیں؟ اس کا باہر ہونا ہے اس لئے وہی جاٹے۔

دوسری طرف باپو ہیں۔ جب پولیس میں ڈپٹی تھے تو کیا کھڑکا ڈر کا تھا ان کا! جمال ہے جو گھر میں دبیر سے بتی جلے، کھانے میں نمک زیادہ پڑے۔ ایسے میں تھائی بسند رشن چکر کی طرح گھومتی ٹٹناتی ہوئی آنگن میں ہوتی تھی۔ کٹوریوں سمیت، اور ایسی گالیاں سننے میں آتیں جو چوک میں بھی نہ مہنی جانیں۔ ادھر ماں گئی، ادھر باپ کو نہ جانے کیا ہوا۔ ایسی آووری پکڑی جس کی کوئی انتہاء نہیں،

جیسے کوئی بان پرستھ لے لیا۔ عورت کا راج اپنے مرد سے ہوتا ہے
 تو مرد کا بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ اب وہ صبح سویرے نکل
 جاتے ہیں اور سیم دانی نہر کے پاس، اکھاڑے کی بغل میں ایک
 پھٹکل، پاکھڑی ہما تما سبج نلسی جی کی چوپائیاں سٹا کرتے ہیں
 یادہ ہما تما ٹھیک سے ارنہ نہیں کرتے بابا پو اپنے مطلب کا
 مطلب نکال لیتے ہیں اور پھر اوری ہو جاتے ہیں۔ رات گھر
 آتے ہیں تو چور دل کی طرح پیر سنبھال سنبھال کر زمین پر رکھنے
 ہوئے گھر بھر میں ڈر کے مارے کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا اکثر
 تو کوئی کھانا بھی نہیں پوچھتا جب بولا کر جا کرتے تھے تو کوئی جواب
 بھی دیتا تھا، اب وہ چپ ہیں تو سارا سنسا رچپ ہے۔ سب
 ہی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ بان پرستھ لیا تو سنیاس بھی لے
 سکتے ہیں۔ پھر پنشن گھر میں نہ آئے تو گزارہ کیسے ہوگا؟ بھیا کی سانبھلو
 کی دکان تو حلقی نہیں۔ زیر کے لئے جو بیج میں گرل مال کیا تھا اس
 کے کا دن ایک دن بیٹھے بٹھائے ان کی ایجنسی بند ہو گئی۔
 بھیا یوں نہیں آتے، بابو گھر میں نہیں رہتے، اب یہاں عورتوں
 کا راج ہے۔ ہم عورتیں سبھی راج کی اچھا کیا کرتی ہیں پر جب مل
 جانا ہے تو سر پیٹ لیتی ہیں: نا بابا! ابسا راج کسی کو نہ ملے۔ وہ

گھڑی کیا جس میں مرو نہ آئے، حکم نہ چلائے، ہر روز کوئی نیا جھگڑا
 فساد نہ چلائے۔ عورت بیرن آخر تو مرو ہی کے نام سے جانی جاتی
 ہے۔ مرد کیا ہے؟ دادی سے پوچھو، بھابی سے پوچھو، سامنے
 والے شاہ میاں کی آپا سے پوچھو، مجھ سے... پر میرا تو وہ
 آئے گا ہی نہیں۔ آئے گا بھی تو چلا جائے گا۔ نیاگی جات کی ہم
 عورتوں کی قسمت ہی ایسی ہے۔

جبھی شبیلا بھابی کو وادی ماں کا ماتھا گرم دیکھنے لگتا۔
 ”دیہ تو، وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتی، ”جی رہی ہے“
 منی سوہی جھپٹا کے لمبے لمبے ہاتھ پیر مارتی ہوئی سوچ بچار کے
 ہچکولوں سے نکلتی اور لپک کر وادی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی
 جو اسے اپنی جوانی اور اس کی گرمی کے کارن ویسے ہی برف
 کا برف معلوم ہوتا اور پھر تھوڑا گرم۔ جبھی دادی کا کانپتا ہوا
 ہاتھ زندگی کی تابعدار میں اٹھ جاتا: سوہی مری مری جی اٹھتی شبیلا
 جیتے جی مر جاتی۔

”دادی کو اوپر ڈالو، شبیلا بھابی، منی چلاتی۔
 بھابی ماتھے پر سات ٹھیکرے بھوڑتی ہوئی کہتی۔ ”دھم ڈالو تو
 ڈالو، مجھ سے نہیں اٹھاتی جاتی یہ گیلی لکڑ۔“

منی اپنے لمبے چوٹے کلاوے میں دادی کو اٹھاتی اور پھر
 سے پلنگ پر لٹا دیتی۔ کوئی ہی دیر میں رشتہ بولنے جوگی ہو جاتی ہوش
 میں آتے ہوئے جس پہلے شبہ کا اُچھا سنا کرتی وہ "منو" ہوتا جس
 کے جواب میں منی بھی ہمیشہ بڑھیا کو بچکا دتے ہوئے بول اُٹھتی
 "دو یا!" جیسی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے دادی منی ہے اور منی
 دادی، دراصل منی اور دادی ایک دوسری کی طرف چلتی ہیں تو بیچ
 میں کہیں ایسے موڑ، ایسے کٹھ پھل جاتی ہیں جہاں ماں کھڑی ہوتی
 ہے جو کبھی اپنے آپ بوڑھی ہو جاتی ہے اور کبھی سچی بھی ہو یا بوڑھی
 عورت سے ماں اپنے کا الزام تو مل ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے مل
 موت میں بھی، امی میں مر جاتی ہے اور مرد بڑے یہی سمجھتے ہیں:
 اس کی آئی تھی اس لئے چلی گئی۔

"تو نے مجھے پکارا نا۔" دادی منو سے پوچھتی۔

"نہیں تو،" منی جواب دیتی، "میں نے تجھے نہیں پکارا۔"

دادی سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہتی:

"دیکھ، میں نے تیرے باپ کو جانا ہے۔" اور پھر، "میں سب

جاتی ہوں تیرے چلتے عورت میں چار سو چار چلتے ہوتے ہیں پر تجھ

میں چار سو پانچ ہیں۔"

اس پیاری سی پٹھکار کے بعد منی تھوڑا اور بھی وادی کے پاس
 سرک آتی: "تیری ہوں وادی" اور پھر ایک ایک منی کو یاد آ جاتا:-
 ہاں ہاں، بے بس ہو کو وادی کو آواز دی تھی، شاید یہی آواز تھی جو
 کھنڈوں پر بھنڈوں کو چیرتی ہوئی وادی تک جا پہنچی اور اسے
 پراس سنسار میں لے آئی پر منی جانتی تھی اوپر جاتی ہوئی وادی بھی تو
 مڑ مڑ کر نیچے دیکھتی ہوگی۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی، ابھی کچھ کام تھے جو
 ادھو سے رہ گئے تھے، جہیں وہ بٹھانا چاہتی تھی۔ منی آخر مان جاتی
 "ہاں، وادی! میں نے پکارا تھا۔ میری اور سنتا کون ہے؟"
 گلی محلے کی کچھ عورتیں مزاج پر سی کے لئے آبائیں شبلا بھائی کچھ
 دیر کھڑی رہتی اور پھر وادی پوتی کے بیچ یہ انوکھی عشق بازی دیکھ
 کر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی اندر سوئی بھنڈا رے کی طرف چل دیتی
 وادی رقص پھر اٹھنا چاہتی۔ بڑھاپے میں اور تو سب چیزیں
 انسان اٹھاتا ہے پر اپنے آپ کو اٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اصل میں
 بوجھ شریہ کا نہیں ہوتا نام کا ہوتا ہے۔ وادی، جو کوئی ہی دیر پہلے
 مر رہی تھی، عورتوں کی مدد لینے سے انکار کر دیتی، منی کے بڑھے
 ہوئے ماتھہ کو بھی جھٹک دیتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی اور منی کی طرف
 دیکھتے ہوئے کہتی:-

”یہی میری دشمن ہے، گلو کی ماں“

گلو کی ماں قریب ہوتے ہوئے پوچھتی۔ ”کیوں ماں، مٹی کیسے دشمن ہو گئی؟“

”میں اچھی بھلی جا رہی تھی، دادی رفقہ کہتی، ”اس مٹنی نے نہ جانے دیا۔“

پیارے سے دی ہوئی اس گالی سے مٹی کے سارے چھوٹے موٹے ڈر، سب دکھ دلدرد درہز جاتے۔ ایسے میں دادی دشمن کی بجائے مٹی کو بچ کر دیتی تو کیا ہوتا؟ پھر دادی کو وہ سارے درش یاد آ جاتے جو اس نے تھوڑی دیر کی موت میں دیکھے تھے۔

”کتنی سندر باٹکا تھی، جمنابا،“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہتی،
”میسے اب پھر باٹکا دکھائی دے رہی ہو؟“ چہلوں اور ہری بھری
بیلیں، اور ان بیلوں میں پھولی، ان پھولوں میں پرکاش، جس میں
بڑے بڑے رشی مٹی بیٹھے اکھنڈ کبرتن کر رہے تھے۔“

گلو کی ماں جمنابا مٹی — سب شر دھاسے سے لگتیں۔ رادی
کبھی آہستہ کبھی تیز انداز کا سب و گیان لٹانے لگتی۔

”کوڑوں سورجوں کا اچھالا، پھر گرمی نام کو نہیں ایسی ٹھنڈک
جو دگر دے و گہ من کو ہر اکو دے، الیسا سکھ پہنچاتے جو کہنے میں

نہ آئے۔ بس ایک ہی آگ تھی جو بار بار میری اور لپک رہی تھی۔
 ”آگ؟ آگ کیسی ماں؟“
 دادی مٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی۔ ”اس پوتی کی

آواز.....“
 جتنا بول اٹھتی۔ ”پراڈا تو شب بھرتی ہے، دادی.....“
 ”مور کھ ہونا، ہوا دی جھلا کر جھنا سے کہتی، ”اتنا بھی نہیں
 معلوم۔ انتر میں شب اور پرکاش میں کوئی مجھید نہیں ہوتا۔“
 ”دہنیہ ہو۔ جھنا کہتی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ہنسکار کر دیتی۔
 ”دہنیہ ہو دادی۔“ باقی کی بھی پکار اٹھتیں۔

اور پھر دادی برابر بولنی جاتی، جیسے کوئی چابی لگ گئی یا جیسے کوئی
 دیر پہلے کی چپ کا گھٹا پورا کر رہی ہو۔ پھر اس عمر میں، جب
 کوئی کسی کی نہیں سنتا، جھنا اور گلو کی ماں کے سے شروتا مل جاتی
 تو اور کیا چاہیے؟ ان سب کو زور زور سے سر ہلاتے دیکھ
 کر مٹی ڈر جاتی۔ پہلے بھاتی اور بھاتی کے جھگڑے کے کارن
 گھر بھر لوگوں کی آدھا رکا برتیاں بنا ہوا تھا، اب دادی کے
 دیوی بن جانے کی وجہ سے سب اور بھی عورتیں آنے لگتیں تو
 پیار سو پانچ چلتر وانی مٹی دادی کی بات کاٹ دیتی۔

”اچھا دادی، وہاں سرگ میں تجھے داد نہ ملے؟“
 ایک ایسی دادی کے ڈال پرے گرے ہوئے سوکھے پتے کی
 رگوں اور ریشوں میں ہریالی دوڑ جاتی اور نو بیاہتا کی طرح وہ
 شرماتے ہوئے کہتی: ”ملے کیوں نہیں رہی مٹی؟“ ایک دم پانسہ
 پلٹ جاتا وہی عورتیں ایک دوسرے کے کولہے میں ٹھوکے دینے
 لگتیں اور اشارے اشارے میں کہنیں:

”دو، دو، دو۔“

”تب دہ کیا بولے؟“ مٹی پوچھتی۔
 ”پیٹروں کی لسی مانگ رہے تھے۔“

مٹی جتنا اور گلو کی ماں اور دوسری عورتوں کی طرف دیکھنے
 ہوئے کہتی: ”دادا ہی کو بہت پسند تھی پیٹروں کی لسی۔“ اور پھر
 دادی سے بولتی: ”کیا وہاں سرگ میں پیٹرے بھی نہیں دہا؟“
 ”پیٹرے بھی نہیں، کھٹی کڑھی بھی نہیں۔“

کھٹی کڑھی دادی کو بہت پسند تھی ا
 ”ایسے سرگ میں جانے کا کیا فائدہ؟“ مٹی کہتی۔

”وہی تو۔“ دادی اپنے بھول پنے میں جواب دیتی، ”کل تم
 دیول کے سچاری جی کو نوڑنا دینا اور ساتھ پنڈت رلیا رام کو بھی

اس پر سب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ ان کی ہنسی نہ سنائی دیتی، دادی کو اور وہ کہے جاتی: ”میرا ہاتھ پکڑ کر بوسے، تم آجاؤ، رفق، اب نہیں رہا جاتا۔“
یہ عورتوں کے صبر کی حد تھی!

دادی بولتی: ”میں نے ہاتھ چھڑا لیا، کہنا: میں ابھی نہیں آسکتی، جگن کے پتا! ابھی کوئی دیر اور میری راہ دیکھو، مجھے دنیا میں بڑے کام ہیں۔“ اور دادی کے چہرے پر کی نمریوں اور جھیلوں میں جھر جھرت پانی کو دیکھ کر عورتیں ایک دم چپ ہو جاتیں۔ دادی ایک ہاتھ تپائی پر پڑے ہوئے گیتا پر رکھ دیتی اور دوسرے سے دھوتی کا پلو تھامتھی، آنکھیں پونچھتی ہوئی ایک جوتی میں نگاہ مٹی پر ڈالتی اور بلبلا اٹھتی:
”ہائے ری سوہی، تو کیسے سوہے گی؟“

اسی ایک ہی بات میں باقی کی عورتوں کا اندر بھی پانی ہو کر اٹکھوں میں چلا آتا۔ آخر وہ اٹھتیں، ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتیں، ”دہنیہ ہو“ ”دہنیہ ہو ماں!“ کہتی ہوئی ایک ایک کر کے چل دیتیں۔

جگن ہاتھ تپاگی اور ان کے بیٹے دیویندر تپاگی کے مکان ڈپٹی

بھون میں کالے بھی آئے اور گورے بھی آئے پر مٹی سوہی کے رنگ کا ایک نہ آیا، اس کے قد کاٹھ کو کوئی نہ پہنچا۔

مٹی سوہی خالی خالی لمبی ہی نہ تھی۔ بدن بھی بھرا ہوا تھا اور رنگ، اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی، نائترک شلیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی یکٹی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ جیاہ شاویوں میں جس میں علوہ یا آڈو پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لئے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں، اوپر پھر کیا علوہ بنتا ہے، کیا آڈو ہوتے ہیں، اگلی بازار میں نکلتی سوہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی، جیسے کہہ رہی ہو، ہٹ جاؤ، میں آ رہی ہوں۔ لوگ راستہ دے دیتے، پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے، جیسے ڈپٹی جگن ناتھ کی نہیں کسی راجہ کی بیٹی آ رہی ہو!

تیاگی کل کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوتیں، چھ چھ فٹ کی، اور بیٹے چھوٹے اور بے بضاعت سے۔ سب بیٹیوں کی شادی میں مٹی مصیبت ہوتی، مٹی خلیج گن۔ اوپر تین چار لپشت میں کوئی ایسی بہو آتی کہ پورے کل کی تباہی لے آتی، ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رکنے

کا نام ہی نہ لیا۔ دادا پہلے آدھی تھے جنہوں نے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کی کوشش کی: دادا سی چھوٹے قدر کی لائے، مطلب اپنی بیوی، مہنی کی دادی۔ خود مہنی کی ماں بیچ کے قدر کی تھی۔ دیوبند کی بیوی بنیلا بھی ناٹی بلکہ بوٹی۔ دادا کے حساب سے اس پشت میں اولادوں کے ٹھیک ہونے کی امید تھی۔ پر شیلانے موتی تو دیوبند ہی لئے، لعل بھی نہ اگلا۔ سب ڈرنے بھی تھے تاکہ میٹیاں چھوٹے قدر کی ہوئیں تو بیٹوں کا کیا ہوگا! پر اس وقت تو مہنی کا سوال تھا جواب پانچ فٹ نواچ کی ہو گئی تھی۔

کئی گھر میاں آئیں اور کئی گھبیں، کتنی سردیوں نے شل کیا بہاریں گھبیں اور پت جھڑیں بھی، سامنے شاہد بھیا کے مکان کے پاس جو کچنارہ کا پیٹر لگا تھا اس نے کئی ہرے ادوے کوٹ پیسنے اور اتار بھی دیئے، ڈپٹی بھون کے باہر، بڑھاؤ کے نیچے، جو شمعیری ڈالی تھی اس میں جو بیاں بھی چلی آئیں، برسات آٹھ، آٹھ، سولہ سولہ بنیس بنیس آنسو روئی اور نئے مکانوں پر نہری اور کالی کائی چھوڑ کر جیسے اپنی سسرال چلی گئی۔ پر مہنی وہیں تھی، بتلی محلے کی رونق، شام گلی کا مذاق۔ اب کے سال جو گہنی پڑی تو حد ہی نہ گئی۔ برسوں میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ جتنا کی دونوں گائیوں کا

و وہ شخصوں میں سوکھ گیا۔ پہاڑوں پر چلے جانے کے کارن لگو کی
 ماں کے گھر آگے بولنے لگے، دن کی روشنی میں اڑنے لگے۔ دھرتی سے غبار
 اٹھتے، اور اپنے دماغ، آسمان پر چھا جاتے۔ بادل آنے بھی تو گر جے
 بر سے بنا ہی نکل جاتے، جیسے کسی بگیا کی سیر کرنے آئے ہوں۔
 ایک دھول سی تھی جو ہر وقت چھاتی اور عقل کو ماڈف کئے رہتی۔
 اس مٹی اور گرہ دے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی آسمان کی طرف
 اٹھل رہی ہے اور آسمان دھرتی کی طرف لپک جاتا ہے۔ اس جس
 اور جس میں ایسی لپک چھپک سے یہ پتا چلتا جیسے پوری کائنات
 کو اختناق ہو رہا ہے۔

اور تو اور آپا فردوس، شاہد کی مہن، جو دو سال سے بھاتی
 کے گھر بیٹھی تھی، چلی گئی۔ دو لہا بھاتی نے پیر کیڑے، معافیاں
 مانگیں، تو بہ میں کان لال کیے اور آپا کو لے گئے۔ شاہد کوئی ایسے
 ہی تھوڑے بھیجنے والے تھے بیچ میں اس قاضی کو بھی لے آئے
 جس نے نکاح پڑھوایا تھا اور حق مہر باندھا تھا۔ آپا فردوس
 کے رخصت ہوتے وقت منی اتار دتی کہ تالاب بھر گئے۔ آپا نے
 بہت پیار کیا، بہت تسلی دی اور کہا: ”میں پھر آؤں گی، منو۔“
 تیری شاوی پر تو انشا اللہ ضرور آؤں گی۔“ منی سو ہی نے فریاد

نظروں سے آپا فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”تب تو تو نہ آئے گی آپا!“

ڈاکمبروں کی بہوتر میک باقی نے کہا: ”سہیلی کے جانے پر تھوڑی کوتاہی اتنا روتا ہے؟“ جب منی نے اپنے آنسوؤں کو خون بنایا اور پی گئی۔ پرواوی تھی جو خون کو آنسو بناتی رہتی شیلہ اب اس سے تنگ آچکی تھی، اس لئے بھی کہ واوی اب پتنگ ہی پر چادر گیلی کر دیتی۔ دیوہندہ کتنا بھی شراپی کہا جی تھا مگر مگر واوی سے پیار کرتا تھا۔ پیار مردوں کو بستا پڑتا ہے اس لئے کہ مرنا نہیں پڑتا بس خانی خونی ہمدردی جتاتی، وینا کی نظروں میں، اپنی نگاہوں میں اچھے بنے اور چل ویئے۔ واوی کے پلہیت کئے ہوئے کپڑے منی دھوتی تھی۔ اس پر بھی شیلہ ناک پر دوپٹہ رکھے ہوئے اندر آئی، باہر جاتی۔ دیوہندہ کو یہ نظارہ بہت تک پڑھا معلوم ہوتا۔ ایک دن وہ بولا:

”تم چاہتی ہو واوی مر جائے؟“

”ہاں۔“ شیلہ بے جھجک بولی۔

”اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔“

”کیا طریقہ؟“

”مہنی کا بیاہ کر دو۔“
 شیلہ ٹپٹا گئی۔ ”میں تو کہتی ہوں داوی بھی جائے اور اس کی
 پوتی بھی۔ مجھے اب کسی کے مرانے نہیں مرے جاتے۔“ اور
 پھر بولی، ”کل بہن غمناکی اور بچی اٹری کا جو تادیکھ نہ ہی تھی۔ میں
 تو کہتی ہوں پہنے، سر بادلوں میں سمائے، کہیں اُوپر کی اُوپر چلی
 جائے۔“

دیوبند رچپ رہا۔
 ”اور نہیں تو کیا۔“ شیلہ پھر بولی، ”د دنوں کے لئے جم راج
 مجھے ڈھونڈنے میں؟“

جم راج ڈھونڈنے کی ذمے داری چونکہ دیوبند بھی تھی اس
 لئے وہ کچھ نہ بول سکا۔ وہ طبیعت ہی سے کام چورتھا، ہر قسم
 کی ذمے داری سے گھبراتا تھا، جو کام اپنے آپ ہو جائے سو ہو
 جائے۔ اپنے پتا گبن ناتھ کی طرح وہ بھی اپنی اس کاہلی اور بے عملی
 کے سلسلے میں شامستردوں اور پرانوں کی مدد لیتا، ہالنس کا سب جتن
 چترائی ہے۔ بھگوان نے کہا ہے تم پورے طور پر اپنے آپ کو میرے
 حوالے کر دو، غمناک سے سب کا راج سدھ ہو جائیں گے۔“
 کام ہو گا یا نہیں ہو گا، اس لئے سچاس فیصد کے تناسب سے

لیسے لوگوں کے کارج سدھ ہو بھی جاتے ہیں۔

دیونیدر برآمدے سے اٹھا۔ صحن میں آیا، ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادل گھر آئے تھے۔ کہوں نہ آتے، یہ موسموں کا چکر بھی ایک سائیکل ہوتا ہے۔ سردی کے بعد گرمی، گرمی کے بعد برسات۔ اُدھر بھی کبھی کسی گول مال سے ایجنسی بند ہو جاتی ہے۔ اُدھر برسات کی پہلی بوند گرمی ادھر گوتم، دیونیدر کے بچپن کا دوست، کلکتے سے چلا آیا۔ جہاں اس کے پاس ہندو سائیکلوں کی ایجنسی تھی اور اب یہاں، دیناپور میں، سب ایجنسی قائم کرنے آیا تھا۔

گوتم قد کے اعتبار سے مشکل سے پانچ فٹ دو انچ کا ہو گا لیکن تن دتوش کے اعتبار سے اچھا تھا۔ اکا با کا سا چہرہ، لال رنگ معلوم ہوتا تھا گالوں میں دو ٹماٹر دبا کے دکھے ہیں، بات بات پر اُچھلتا، جیسے نہ جانتا ہو اس صحت کا کیا کرنا ہے۔ دیونیدر نے گوتم کو چائے پر گھر بلایا۔

شیلہ کے کان گوتم کی باتیں سنتے سنتے پک گئے تھے۔ لیکن اس نے اسے دیکھا نہ تھا۔ شاید اس سے پہلے گوتم اس گھر میں کبھی آیا بھی نہ تھا، اس لئے مہربانی تو سنے میں بھی نہ دیکھی تھی۔ شیلہ اسے یوں

تپاک سے ملی جیسے برہمنوں سے جانتی ہو۔ دیویندر نے شیشلا کو چائے لانے کے لئے کہا اور پھر اٹھ کر اس کے کان میں کھسر بھسرتے ہوئے اندر بھیج دیا۔

لبس، یہی غلطی ہوئی، شیشلا اندر گئی تو چائے بناتے ہوئے منی سے کہہ دیا: ”منی اندر بیٹھک میں نہ جاؤ۔“
 ”کیوں؟“ منی نے پوچھا، ”وہ آگئے، بھیا کے....“
 ”ہاں۔“

اور پھر شیشلا خود کیتی و تیلی نکالنے لگی۔
 بھابی منع نہ کرتی تو شاید منی کو کچھ نہ ہوتا، لیکن اب اس کے تن بدن میں کوئی آگ می لپک آئی۔ وہ اب اس حالت کو پہنچ گئی تھی جس میں لڑکیاں آنکھیں بند کر کے صرف آوازیں سنا کرتی ہیں اور پھر بے دم ہو کر گر جاتی ہیں۔ منی سو ہی کے لئے شاید آواز کافی نہ تھی، بھابی کے اندر جاتے ہی وہ برآمدے کی طرف لپکی اور سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی خیم جھٹے پر جا پہنچی جہاں ایک روشندان بیٹھک کے اندر کھلتا تھا۔

شیشلا ٹرے میں چائے اور کچھ دال موٹھ وغیرہ لئے بیٹھک میں آئی، دیویندر نے اچھلتے ہوئے کہا: ”ٹھہرو، میں کچھ پیڑ سے

لے آؤں۔“

”ارے نہیں بھائی۔“ گوتم نے روکا۔

”ایک منٹ میں آنا ہوں۔“ دیویندر نے کہا، ”میں جانتا ہوں تم

پیڑ پر بہت پسند کرتے ہو۔“ اور اس سے پہلے کہ دیویندر کو

کوئی روکے وہ نکل گیا تھا۔

مئی روشندان سے دیکھ رہی تھی: گوتم آگے بڑھ بڑھ کر بھابی

شیلہ سے دیوید کا رشتہ جگا رہا تھا۔ دیوید بھابی کا رشتہ جو ایک طرح

سے ہر دیوید کے لئے شادی کی رہبر سل ہوتا ہے جس میں ادب کی

حد سے پرے اور ننگے پن کی سیما سے ورے کی باتیں ہوتی ہیں۔

بھابی چیز بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی ہرنس، اس کا ہر پور چھڑنے

کے لئے تیار رہتا ہے۔ گوتم شیلہ سے کہہ رہا تھا: ”کوئی زور لگاؤ

بھابی، ایک بیٹا جن دو نہیں تو یہ بھیا میرا دوسری شناوی کرے

گا۔“

دیویندر ابھی آئے نہیں تھے۔ بھابی نے دال والی پلیٹ سامنے

رکھ کر چائے انڈیلی اور کہا: ”ہاں دیوید جی، یہ کہہ بھی رہے

تھے۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”یہی کہ اگلی بیساکھی تک کچھ نہ ہوا تو یہ دوسرا بیاہ کر لیں گے“ اور شیلانے جان بوجھ کر منہ پرے کر لیا۔ جیسے رونے لگی ہو۔ گوتم لپک کر اپنی جگہ لے اٹھ کھڑا ہوا ”سچ بھابی؟“ اور اس کے ہاتھ ان جانے ہی میں آستینیں چڑھانے لگے بھی اسے ایک کھلی سائی وی۔ بھابی ہنس رہی تھی!

گوتم سمجھ گیا، ایک تسکین کی سانس لینے ہوئے بولا:

”اوہ بھابی! تو نے تو میری جان ہی نکال لی،“ اور پھر چادر پانی پر دھم سے بیٹھ گیا جو صوفے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

بے وقوف تو گوتم بن ہی گیا تھا لیکن اس ہزیمت سے بچنے کے لئے برابر ہاتھ پیر مارتا رہا ملاحظہ ہر سے گھر آنے سے پہلے دونوں دوستوں میں کچھ تر راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہوں گی۔ چائے کی پیانی تھامے ہوئے وہ شیلانے کے قریب ہو گیا اور کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولا: ”مذاق کی بات نہیں بھابی، سنا ہے۔ دیونیدر بھیا نے ایک نرس رکھی ہے،“

شیلانے کے من میں آگ کا ایک بھبھا کا سا اٹھا سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ اب وہ نہ مذاق کر سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی اس کے واہم، کو بوٹھیں لگی تھی اس میں اس نے گوتم ہی کا تختہ کر دیا۔

ایک دم ناک پھلاتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے، مرد ہے تو رکھنا ہے
 نا! اور کیا تم سا چرم عورت رکھے گا؟“
 دیوبند ریپڑ سے لے کر آیا تو گوتم رد مال سے اپنے ماتھے پر
 سے پسینہ پونچھ رہا تھا!

منی کی تلاش میں دادی دامن گھسٹتی ہوئی پنجم چھتے پر آئی تو
 دیکھا منی بے ہوش پڑی ہے۔ دادی نے سر پٹتے ہوئے آدایں
 دیں شیلا آئی، پھر گلو کی ماں اور سب نے مل کر ایک چھپے سے منی
 کی دندان کھولی، ماتھہ اور پیر مل کر سیدھے کئے۔ بٹھا ڈراما ہوتا
 مگر گوتم جب تک رخصت ہو چکا تھا۔

پچی پچی جگہ، سایہ آسید کی باتیں ہونے لگیں لیکن جیتنے سے سب
 جانتی تھیں یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ منی ہوش میں آئی تو شرمندہ
 تھی، اپنے آپ سے شرمندہ۔

”نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟“ وہ بولی اور دادی کی گود میں
 سر رکھ کر بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔

خام تک منی ٹھیک ہو چکی تھی اور گھر کا کام کاج کر رہی تھی۔
 آج شیلا نے سبزی اور وال دونوں میں غلطی سے دوبار نمک ڈال
 دیا تھا۔ اب وہ اور منی دونوں ڈر رہی تھیں۔ باپو آئے تو کیا

ہو گا وہ تو عام نمک سے بھی کم پسند کرتے ہیں! کہیں پہلے نے جلال
میں آئے تو تنہا لی کٹوری سب باہر پٹخ دیں گے۔

رات باپو آئے ہمت کر کے منی نے کھانا پر دسا اور باپو نے کھانا
شروع کیا۔ شیلہ اور منی دونوں کی آنکھیں باپو کے چہرے پر جمی ہوئی
تھیں۔ پہلا ہی گراس باپو جی کے منہ میں رکھا، پھر انہوں نے یوں اندر
نگل لیا جیسے روٹی نہیں حلوہ کھا رہے ہوں۔ شیلہ نے معذرت
کرتے ہوئے کہا:

”آج نمک کچھ زیادہ ہی پڑ گیا ہے، باپو جی۔“

باپو جی نے ایسے کہا جیسے انہیں کچھ بتا ہی نہیں، بولے: ”نہیں
تو بیٹا، نمک تو ٹھیک ہے، بالکل برابر ہے۔“

دو چار نواسے اور منہ میں ڈالتے ہوئے بولے: ”دراصل آج مجھے
مجھک ہی نہیں ہے۔ جہانم جی نے دھڑا پر سادو سے دبانا۔“

منی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور ووڑ کر جہانم کے ماں سے
متھوڑی والی لے آئی اور باپو کے سامنے رکھی۔ باپو جب تک تنہا
پہرے سر کاچکے تھے۔ شیلہ اندر بستر ٹھیک کرنے کے لئے چلی گئی تھی
منی نے کٹوری تنہا ہی رکھ کر اسے قریب کرتے ہوئے کہا: ”کھانا
پڑے گا، باپو جی۔“

باپو جی کو بھوک تو لگی تھی، چپکے سے نوالہ توڑ کر دال میں بھگوتے
اور منہ میں رکھتے ہوئے اندر کی طرف دیکھا اور بولنے لگا: ”ہو کیا
کسے گی؟“

دوسرے دن گوتم کو آنا تھا۔ لڑکی دیکھنے لگی
منی کو تو کوئی امید نہ تھی۔ مہاجی نے جو اس کی دردناکی تھی
اس کے بعد تو کوئی بھی مرد اس گھر میں نہ گھسنا، پر اس کا بیٹا اٹاٹلا
مہاجی کے شبہوں نے گوتم میں کامرد اور بھی تلخی سے جگا دیا۔
بیٹھک میں آج باپو تھے، دیوبند بھی اور دادی بھی منی کو ساوہ
مگر خوبصورت کپڑے پہنا کر ایک طرف بٹھا رکھا تھا اور اسے کڑی
ہدایت تھی کہ اٹھے نہیں در نہ سب معاملہ چوہٹ ہو جائے گا۔

گوتم آیا اس کی پگڑی کو بہت کلف لگا تھا۔ شملہ سر پر ایک فٹ
اوپر اٹھا ہوا تھا اور اپنے نلے قد کے باوجود وہ لمبا معلوم ہو رہا
تھا۔ آتے ہی اس نے منی کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔ منی کی محبوب
نگاہیں زمین پر گر گئی ہوئی تھیں اور اندر ہی اندر وہ کانپ رہی تھی
ہاتھ پر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ایکا ایکی گوتم کچھ اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگا، پھر اس نے منی
کی طرف دیکھا اور دیوبند سے بولا: ”بھیا، تم بھی پانی پیو گے؟“

”ارے ارے! پانی کیوں؟“ دیو پسند نے کہا، ”کوئی شہرت لاؤ شیلا۔“

شیلا کی بجائے خود حکم لینے کی عادی منی ایک ایکی اٹھی۔ دادی نے دھپ سے ایک ہاتھ منی کے سر پر مارا۔
 ”بیٹھی رہ، تو کہاں جا رہی ہے؟“
 اور منی جو آدھی ہی اٹھی تھی بیٹھ گئی، لیکن آدھی ہی میں وہ ساری معلوم ہو رہی تھی۔ اسے کچھ یاد آیا، کچھ بھول گیا۔
 اس شام محلے بھر کے منہ میٹھے ہونے لگے، بدھائیاں ملنے لگیں گوتم نے منی سوہی کو پسند کر لیا تھا۔

سب کو یقین ہو گیا تھا کہ منی سوہی جا رہی ہے۔ لیکن نہیں یقین آ رہا تھا تو دادی رمن کو۔ ”میں تو اس دن مانوں گی جس دن سچی برڈٹی بھون کی دہلیز چھوڑے گی اور ڈولی میں بیٹھتے ہوئے پوری ایک پائیلی چادلوں کی اپنے سر کے اوپر سے پھینکے گی۔“ اور پھر جیسے شادی میں ہونے اور نہ ہونے والی باتیں دادی رمن اپنے سامنے دیکھ رہی تھی:

”دیکھ ہو گو تو کا باپ ڈولی پر سے کھوٹے پیسے بھی پھینکے

تو انہیں ہر سچ بھنا۔ پھر اس بات کا ڈر کہ جس بات سے ڈر و آخر وہی ہوتی ہے۔

وادی نے دیول میں موہتی کے لئے دستروں کی منت نو مانی ہی تھی پڑھن شاہ کی درگاہ پر وہ لوہے کی دیگا۔ جی مان آئی ساتھ دہ۔
نفاہ کی اس کو بھی لے گئی تھی، جیسے رشوت کے طور طریقوں کی اچھی طرح سے نہ جاننے والا کسی بچہ لے کسی ذات کار کو ساتھ لے لیتا ہے تاکہ قانون کہیں اٹا ہی نہ پڑے۔

اب بیاہ کے سلسلے میں چاروں طرف سے منی کو ہدایتیں ہونے لگیں: جو جانی تھیں وہ بھی اور جو اٹھ تھیں وہ بھی اپنے اپنے طریقے سے مرد کو مطیع کرنے کے طریقے بتانے لگیں، اور پھر وادی جس کے مرد کو گئے ہوئے پچاس سال سے ادھر پر ہونے کو آئے تھے اور جس کے بچاروں میں مرد اس کی آنکھوں کی طرح دھندلا سا ہو کر رہ گیا تھا، بولی: ”دیکھو بیٹا، میں تیرے نمکٹ ہوں گی بھی اور نہ نہیں بھی۔ ماں جہاں ساکن کھڑی ہو سکتی ہے وہاں بدھوا تو نہیں ہو سکتی۔ یہی ہے ساری دنیا کی ریت، یہی شاہستر پڑان بھی کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی، آنکھیں پونجستی ہوئی جا رہی ہوتی، ”اور سن،

جب پھیرے ہوں گے ناتو جھک کے چلنا، بہت جھک کے، بیرن
 نہیں کیا کروایا بسبب دھرا رہ جائے گا۔ دیکھ، یوں، اور پھر
 دادی، رفق سر ہر اپنے بیٹے جگن کی بندھی بندھائی پگڑی رکھ لیتی
 اور اٹکتے ہیں، کہہ ان کی بگڑ کپڑے دسو۔ نے والی تنہا، اور ردولہا
 بنی، ادنیٰ اپنی طرف سے اکثر اکڑ کر چلتی۔ تو رقی ہنسٹیں، لڑکیاں
 لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی، ایک دوسرے کے دہتر لگتیں،
 مٹی شرافتی، روتی پودادی، اسے برا بر چھپے جھک، کر آنے کے
 لئے کہتی۔

گاد کی ماں پکارا ٹھکتی: ”چھ پھیرے لیا اناں، ساتواں
 دست لیا،“

گلو کی ان کامیاب تھا سات پھیرے ہوئے تو مٹی کی دای
 کے ساتھ شادی ہو جائے گی، ایسی شادی جسے دیدر شاستر نہ کیا
 سو تم جگوان بھی نہیں توڑ سکتے۔

جب مٹی پیچھے آتی ہوئی حضور اکرم جھکتی دای مڑ کر دھب،
 سے ایک ہاتھ اس کے سر پر مارتی، ”پنچی، اور پنچی مٹی ورد سے
 بیللاتی ہوئی روتی بھی اور ہنستی بھی۔“ بھاڑ میں ہوائے الیا دولا،
 وہ واوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی، ”جب دقت آئے گا تو

دیکھا جائے گا،، دادی اسے پھسکا رہی :

”نسیبوں چلی، عورت نہ جھکے تو اس دنیا کا پکڑ نہیں چلتا۔
 نو برس سو گوار ہوئے۔ جو بچا ہوتا ہے۔ آخر وہی اوسچا ہوتا ہے اور
 پھر تو؟ بچھے تو اور بھی بچی ہو کر چلنا چاہیے جسے سو کم بھگوان نے
 اونچی بنایا۔ مرد کا سوا گت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جاچک ہوتا ہے نا
 تمہیں کوئی دان مانگتا ہے جو دنیا ہی اچت ہے۔ کبھی دیوی بھی
 پکا دی پر اپنے کو اڑ بند کوئی ہے؟“

یر دادی کو بھی نہ معلوم تھا کہ دیکھنے میں یہ سرکش لڑکی وقت
 آنے پر جھک کے چلتا تو ایک طرف، ریگٹے، لیٹ جانے کو بھی
 تیار ہوگی۔

شام لگی میں ایکابی بیسیوں ہی لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ وہ
 آج تھوڑی سی پیدا ہوتی تھیں؟ تمہیں وہ سیں: برسوں، صدیوں
 سے: بس بیاہ کا شہد اپارن کرنے کی دیر تھی کہ وہ جیسے کسی جادو
 کسی جہتر کے زور سے بے اختیار، بے بس، ایک دوسری پر
 گرتی پڑتی ہوئی کہیں سے آگئیں، جیسے آموں کے موسم میں
 بڑی بڑی ہری نیلی مکھیاں کہیں سے اپنے آپ چلی آتی ہیں اور
 جب تک کوئی آم چوستا رہے وہ اور وگرہ منڈ لانی، بھنبھناتی

رہتی ہیں، آتے ہی وہ کوئی ڈھونک ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور ایسے ایسے
 نورانی گانے گاتی ہیں جو داوی کی آنکھوں کی طرح کی دھندلی صدیوں
 سے ان کے گلے میں اٹکے ہوئے ہیں۔ پھر ایک جیجا دار کرنے کو ملتا ہے
 جیسے ہر عورت کو بدن سہلوانے، دیوانے سے ایک عجیب طرح
 کا رتھ، ایک خاص قسم کا خط آتا ہے ایسے ہی ان لڑکیوں کو بھی جب
 کوئی جیجا یا رات میں آیا ہو کوئی منجلا ان کے چٹکی کاٹ لیتا ہے اور
 یا کمر میں اس جگہ کو چھو لیتا ہے جہاں بجلی کے سینکڑوں ہزاروں
 کلواٹ جمع ہوتے ہیں۔ باہر تو کوئی ڈر کے مارے ان کی طرف
 انگلی اٹھانے کی ہمت کرتا ہے اور زیر اٹھانے دیتی ہیں لیکن شادی
 بیاہ میں ان باتوں کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ بڑے، چھوٹے — سب
 دیکھتے ہیں اور مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں۔ چیخے کو بھی تو سالباں
 ملتی ہیں۔ ایک ایک سالی، آدھی گھر والی۔ اتنی لڑکیوں کا جھڑٹ
 چھڑنے، پیار کرنے کو پھر زندگی میں کہاں ملتا ہے؟ اور یہ
 سائیاں اپنے روپ کی کوئی جھلک دکھا کر قدم قدم پر کوئی انگھٹ
 پیدا کرتی ہوتی کہیں چھین، کہیں الوپ ہو جاتی ہیں جیسے یوگیشیروں
 اور تیشیروں کے من کی مینکا میں، اللہ والوں کی حوریں جو انہی کے
 داخلی تنہیل کی پیداوار ہوتی ہیں جس کے کا دن ان آسمانی عودوں

کے بدن پر ایک بھی تو خط غلط نہیں لگا ہوتا۔ اگر یوگی پتلی عورت کو پسند کرتا ہے تو وہ تلی ہوتی ہیں، بھری پرسی کا گردیدہ ہے تو وہ بھری پرسی، اور یوگیشور اپنی کے ساتھ آنگن، اپنی کے ساتھ پریم کمبل کے لئے چل جاتا ہے اور آگے بڑھنے، اوپر جانے سے انکار کرتا ہے۔ یوگیشور کو پکارتے پکارتے شیر دہنی گودو کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور حیوتی سروپ البشور کی آنکھوں سے جوت جاتی رہتی ہے۔ اور یہ ایسراپن، یہ حرپن یوگیوں اور صوفیوں کو اپنے رتبے، مقام سے گرا کر اس خلوت صبح سے ہمیشہ کے لئے غلط ہو جاتی ہیں۔

مگر یہ دنیا کتنی پیاری جگہ ہے جہاں کے لوگ خدا نے بنائے اور پھر فرشتوں سے کہا: "ان کو سجدہ کر دو،" سالیوں کے چلے جانے کے بعد آخر ایک دن، ایک رات عظیم "وہ" سامنے بیٹھی ہوتی ہے۔ دیدوں کے منتر اور شاستروں کے ارتھ جس کی طرف کبھی واضح اور کبھی مبہم سے اشارے کرتے ہیں، بیابان شادی کے گیت جس کے لئے مرتعش اور مہٹوں میں جس کے لئے اینٹیں پکتی ہیں، بل میں کام کرنے والا مزدور جس کے لئے پان بیڑی کی دکان پر پہنچ کر اپنی جیب کی آخری روٹی سے آنکڑ اٹھاتا ہے اور

سبھاؤں میں شور و خروش کے لئے بڑھتا ہی جاتا ہے، جیسے اس کے
 بچوں کی ماں ہونا ہے اس لئے وہ اس دھرتی کی طرح ڈرتی سمٹتی
 ہے جس میں کسان آتا ہے، ہل کا ندھے پر ڈالے ہوئے جس کا
 کا تیز اور تیکھا پھل ابھی ابھی کسی لوبار نے تیز آچخ والی بھیٹی میں
 ڈھالا ہے۔ سر پر پگڑی باندھے، کلغی سجاتے وہ راجہ جنگ معلوم
 ہونے لگتا ہے جو دھرتی کو الٹائے گا تو نہ جانے کب سے اس میں
 دبی ہوئی کوئی ٹمکی پھوٹ جائے گی اور اس میں سے بڑے ہی صبر
 بڑے ہی انتہار، بڑے ہی پیار والی جنگ دلاری سینٹا پیدا ہوگی
 جس کے لئے اس کا عظیم ”دہ“ آتا ہے، ایک ماتھے میں مقدس
 کتاب دوسرے میں شراب لیتے تاریخ کے دھندے اداوار میں
 وہ ان گنت گویوں سے کھیلا ہے، ان کے ماتھے بے شمار راسیں
 رچاتی ہیں۔ اور اب اس کی آنکھوں میں ڈر ہے اور حیرت اور ہمیت
 وہ سمجھتا ہے اس بار کسی نر و تازہ، حسین و جمیل و شیرہ کے بدن
 پر قبضہ جمائے گا، بار بار اپنائے گا، بے ہوش ہو ہو جائے گا۔ با
 اور نہیں جانتا وہ محض ایک تنکا ہے زندگی کے بھر زخار میں، صرف
 ایک بہانا ہے تخلیق کے اس لامتناہی عمل کو ایک بار چھڑ دینے
 ایک بار حرکت میں لے آئے گا اور پھر بھول جانے کا دینا بھر کے

گوداموں میں بھرا ہوا اناج کسی وقت ایک دانہ محض نہ تھا جو شاید اب اس دانے کو بھی معلوم نہیں کیونکہ موت اسے لوٹ چکی ہے۔ زندگی ایک بار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے۔ کاش انسان کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ ایک بھوکے کی طرح عورت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے؛ پھر عورت بھی خواہ مخواہ اپنی عصمت نہ بچاتے، اس پر سونے چاندی کے وزن نہ لگاتے۔

شادی کو کچھ ہی دن رہ گئے تو نیا چلا گوتم نے سائیکلوں کی ایجنسی چھوڑ دی ہے اور آسام میں ڈیما پور سے پچاس ساٹھ میل دور کسی جنگل میں کوئی ٹھکانہ لے لیا ہے جہاں جینے ایک کے بعد کہیں چٹھی پہنچی تھی، جیسے ہوائی ڈاک ریل گاڑی سے نہیں پیدل چل کر جاتی ہو۔ شادی ایک غیر معین سرے کے لئے ملتوی ہو گئی!

وادی کی تو جان ہی نکل گئی، اسے پسینے آنے لگے۔ ٹھنڈے پسینے — جن کا باہر کی سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے جب بھی گوتم کی چٹھی آتی وادی رفقہ نے منی سوہی کو بلایا اور اس کا سرچوم چوم لیا۔ بلایا اب کے بھی، لیکن چومنے کی بجائے زور کا ایک دھمکڑا اس کے سر پہ جڑ دیا۔ یہ لڑکی ہی منحوس تھی، مگر منحوس

گھڑی میں پیدا ہوئی، کسی منحوس ماں باپ کے گھر جنم لیا اور اب جہاں
 بھی جائے گی تباہی لائے گی، دنیا پورا اور ڈیما پورا تو کیا پورے
 بہار، پورے بنگال، آسام ولس میں تباہی اور بربادی لائے گی۔
 پھر گیتا کے پنے کھلے، پھر ستر ہوئی اور پھیانے کا پاٹھ ہوا، پھر دای
 مری، پھر جی اٹھی کیونکہ پاٹھ کی سمپتی کے ساتھ ہی گوتم کی چٹھی چلی
 آتی تھی جس میں لکھا تھا اگلے سال منی کی میں تاربخ کا سا ناکلا
 ہے۔ داوی سمجھ بیٹھی تھی گوتم نے کہیں منی کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے
 اور سوچ لیا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم منی، بیٹھی ہوئی منی، کی کثافت
 نے گوتم کے پورے ذہن کا کچھ یوں احاطہ کر رکھا تھا کہ وہاں
 اب کسی اور لطیف سی سوچ اور سمجھ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ التوا
 تو ایک مجبور سی تھا۔

وادی ایک بار پھر بیٹنے اور دن گننے لگی۔ جیسے بیوہ چھت
 کی کڑیاں اور رنڈا آسمان کے تارے گنتا ہے، اور ایک ایک
 انسان تو کیا وہ بھگوان، آگ، پانی، ہوا — سب کو گالیں دینے
 لگتی۔ اس میں صبر تو حد درجے کا تھا لیکن شکہ نام کو نہیں۔ جب
 تک منی پانچ فٹ سوا اس اپنچ کی ہو چکی تھی۔ اس کی کوانی اس
 قصے کی طرح ہو گئی تھی جس میں قصہ کہنے والا اپنا سر بچانے کے

لئے بادشاہ کو ایسی کہانی سناتا ہے جو ختم نہیں ہو سکتی، سو راج میں سے چٹہ پآ آئی اور دانہ لے گئی۔ چٹہ یا پھر آئی اور ایک دانہ اور لے گئی۔ اور کوٹھڑی دانوں سے بھری پڑی تھی، آسمان ستاروں سے پٹا ہوا تھا، شاہد میاں کے گھر کے پاس کچنار میں ہزاروں لاکھوں کوئلیں پھوٹ رہی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ بیاہ اور صرف بیاہ ہی اس طوفانی عمل کو روک سکتا ہے۔ ورنہ کوئی ہی دن میں منی کا سر آکاش میں ہو گا اور وہ اوپر کی ادھر چلی جائے گی، جیسے کنس کے نیچے زینے سے ہما یا یا بجلی بن کر آسمان کی طرف لپک گئی تھی۔

”جب تک تو گوتو بھی لمبا ہو چکا ہو گا۔“ دادی کہتی۔
 ”کیا پتا، سیا؟“ جتنا کہتی۔ پھر ڈگامبروں کی ہونٹریک باقی ایک قدم آگے بڑھ کر بول اٹھتی۔ ”ہو سکتا ہے، ایچ دو ایچ چھوٹا بھی ہو گیا ہو۔“ اور پھر وہ ایک دوسرے کوٹھو کے دیتے ہوئے مسکانے لگتیں۔

”ارے!“ دادی ترمیک بانی کو جھٹکا رتی، ”دیس اتنا بھی نہیں سمجھتی؟ پوتی! ایک بار جو بڑھ جاتے پھر نہیں گھٹتا۔“ اور پھر، ”میں بوڑھی جبرور ہو گئی ہوں، ترمیک! پر عقل میں تجھ پر بس

ہوں ہیں۔“
 پھر گلو کی ماں حساب کر کے بتاتی۔ ”اگر بڑے کا قدر اتنا ہی ہے
 دادی! اور لڑکی کا چار پانچ گروہ، دو تین انگل بڑھ جائے تو وہ آپنی
 چھوٹا ہو گیا کہ نہیں ہو گیا؟“

اتنا حساب دادی کو کہاں آتا تھا مٹی سوہی کے دو تین انگل
 اور لمبی ہو جانے کے خیال ہی سے خون اس کے خشک چہرے کی
 رگوں اور ریشوں میں ووڑنے لگتا، یوں معلوم ہوتا جیسے پیل سے
 گرا ہوا پتہ پھر اپنے ڈال پہ جا لگا ہے اور دوسرے پتوں سے ٹکرا
 رہا ہے، شور مچا رہا ہے۔ وہ تہہ میکا کو بیا گلو کی ماں کو گالیاں دینے
 لگتی، چھوٹا ہونیرا باپ، چھوٹا ہونیرا بھائی، چھوٹا ہونیرا خضرم،
 اور عورتیں یہ سمجھتی ہوتی کہ دیوی دادی کی گالیوں سے گروہ ٹلے ہنستی
 کھیلنی بڑے گھر چلی جاتیں، جہاں انہیں اپنے مرد، کیا باپ اور کیا
 بھائی اور کیا شوہر، ایک ایک کی چھوٹے معلوم ہونے لگتے۔

مٹی سوہی اب تک اپنی ہرنس، اپنے ہر پور سے نفرت کرنے
 لگی تھی۔ وہ تھادی بیاہ کے نام ہی سے خائف ہونے لگی، کیا تھادی
 بیاہ ہی رہ گیا ہے اس دنیا میں؟ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں
 کہیں بھی جانا ہو وہاں پہنچنے کے لئے بیسیوں رٹکیں، سب بکڑوں بگڑتی ہیں

ہوتی ہیں، بیاہ کے لئے کیا ایک ہی جرنیلی سڑک ہے؟ آخر تھک مار
 کر منی لیٹ جاتی، سو جاتی — جہاں اسے خواب میں دو لمبے ہی
 دو لمبے دکھائی دیتے۔

ایک دن دیویندر انگریزی تصور "مولان زوش" دیکھ آیا
 جس میں اداکار، جوڑے فیرار، اپنے پیڑھے باندھ کر فرانس کا بونا
 مصور لٹرک LUTREE بنتا ہے پہلے تو دیویندر نے نو نو کروڑ گالیا
 اپنے دلش سہارت کو دیں جس میں اتنا زور لگانے پر بھی صنعتی
 زندگی نہیں ہوتی، جہاں سائیکل کے کچھ پرزے ابھی تک ولایت
 لے آتے ہیں، جہاں میک اپ کا آرٹ اتنا بھی نہیں پیپ سکا
 جس سے لمبے قد کا ایک آدمی ٹھگن اور بونا لگ سکے، اور اس بات
 کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ پہلے ہی ٹھگنا ہے۔ اس سے اور ٹھگنا
 نہیں ہو سکتا۔

اس پر بھی دیویندر نے جوڑے فیرار کی طرح اپنے پیڑھے
 کی طرف باندھے اور گھسٹوں کے بل چل چل کر منی کو دکھانے لگا،
 "ایسے ہی پیڑ باندھ لینا، منی! تب گوتم کے ساتھ ٹھیک سے پھیرے
 لے سکے گی۔"

”اگر وہی کھل گئی تو، منی کی سیلی گورنر پوچھتی۔“

”تو چپ کرنا۔“ دیویندرا سے ڈانٹ دیتا، ”منی کا تو پھر بھی
 بیاہ ہو جاتے گا، ڈھائی فٹی اتیرا کبھی ہو گا ہی نہیں۔“
 اور چھوٹے قد کی گوراں دیویندر کو دانت دکھاتے ہوتے
 ”ای ای ای“ کرتی اور پھر ایک طرف چھپ کر ررنے لگتی اور
 پھر آپی اپنے آپ کو منا کر منی کے پاس آجاتی اور کہتی:
 ”منا! کہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اپنا کچھ قد مجھے دے دے
 اور میرا کچھ آپ لے لے۔“

”ایسا ہو جاتے تو پھر دنیا ہی نہ بس جاتے۔“ منی جواب
 دیتی۔

اور پھر دونوں مل کر اس اُجڑی ہوئی دنیا کو مپٹی مپٹی آنکھوں
 سے دیکھنے لگیں جہاں ابھی تک دیویندر اپنی ہیکڑ میں گھٹنوں
 کے بل چل کر منی کو دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”ایسے۔ ایسے۔ کسی
 کو پتا بھی نہ چلے گا۔“ اپنے الٹے طریقے سے وہ اس لمبی لڑکی کو
 وہی بات سمجھا رہا تھا جو آج سے صدیوں پہلے ارسطو نے عورت
 کے نیچے گھوڑا بنتے ہوئے سکندر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن
 پوری طرح سے سمجھا نہ پایا تھا! اس ادھورے کام کو دیویندر
 پورا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے اذیت ہو رہی تھی

لیکن کرب کا کوئی بھی اثر وہ اپنے چہرے پر نہ آنے دیتا۔ خامی پر
 تنک وہ چلتا رہا، حتیٰ کہ اس کے گھٹنے چھل گئے، ترمیکا اور جمناس
 کی طرف دیکھ کر ایک دوسری کو کنیاں مار رہی تھیں اور سنس
 رہی تھیں اور سنس رہی تھیں اور پکار رہی تھیں۔ دوسریلا۔
 اری اور شیلار۔

آخر ایک دن برات آہی گئی، پھیرے بھی ہو رہی گئے۔

پھیروں میں منی دھری منری ہو کر چل رہی تھی لیکن اب اس
 بات کا کیا علاج کہ اتنی بچی ہوتے ہوئے بھی وہ گرم سے لمبی لگ
 رہی تھی۔ ترمیکا کا خیال صحیح تھا۔ گرم کا قدا در بھی چھوٹا ہو گیا تھا
 اور بامنی کا بڑا پل پل کے بعد پھیرے لیتی ہوتی منی کے کان میں
 کوئی کہہ دیتا۔

”بچی، اور بچی۔“ منی نے دھرتی میں گھس جانے کی کوشش
 کی لیکن دھرتی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ آسمان کی طرف لپک سکتی تھی
 دھرتی میں نہ سما سکتی تھی۔

آشیر وادی کی جگہ گئی بار وادی کے گپ چپ دھبے منی کے سر
 پر پڑے جس سے اس کا سر بول اٹھا۔ وہ تو اسے اپنی آخری
 مصیبت سمجھتی تھی لیکن وادی کا خیال ایسا نہ تھا۔ جو جھوٹ اس

نے اور اس کے بیٹے، پوتے اور تیلی محلے کے سب مرد عورتوں نے مل کر بولا تھا آخر تو اسے کھلنا تھا۔ وادی چاہتی تھی۔ کھلے تو کھلے پر ابھی نہ کھلے۔ ایک بار شادی ہو جائے پھر اسے انسان نوکریا بھگوان بھی نہ توڑ سکیں گے۔ لیکن آخر وہ پھر منی کو ادبنا ہو کر چلتی ہوئی، دیکھتی تو اپنے کلبچے میں مکا مارنے ہوئے کہتی، "ماتے رائڈ، تو نہ بے گی۔"

پنڈت لوگ منتر پڑھتے رہے۔ جن کا مطلب تھا: تم جانوروں کی طرح سے نہیں رہو گے۔ بے موسم کا بھوک بلاں نہیں کر دو گے۔ تم بیمار اور فائز العقل بچے اس دنیا میں نہیں لاؤ گے۔ اور ارد گرد کے لوگ بیمار اور فائز العقل بچوں ہی کی طرح سے بیاہ کی رسم کر دیکھ رہے تھے، شاید اس لئے کہ وہ شکوکوں کی زبان — سنکرت — سے واقف نہ تھے:

بیاہ ہو جانے کے بعد جب بھی گوتم اندر رڈ پٹی بھون کی ٹھیک میں آیا اس نے منی کو بیٹھے ہوئے پایا منی کو اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کی سخت مٹا ہی تھی جس سے اس کے بدن کی ہڈیاں تک اکثر گہن — اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوئی، ابھی تک۔ ماں کی کرکھ میں پڑی ہے

اور باہر آنے، ماتھہ پیر پھیلا نے کے لئے تڑپ رہی ہے۔
 سوکھ مٹی نے گوتم کو اپنا داماد اور مٹی کو اپنی بیٹی جانتے ہوئے اپنے
 گھر کھانے پر بلا یا لیکن دیوبند نے اسے سمجھا بھجا کہ لوٹا دیا شام کے
 قریب گوتم نے سینما دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ
 جانا کوئی موج اڑانا چاہتا تھا لیکن دادی نے انکار کر دیا۔ وہ غور
 تو کچھ نہ بولی لیکن اپنے بیٹے جگن ناتھ کو اشارہ کر دیا۔ جس نے
 بڑے پیار کے ساتھ گوتم سے کہا: ”یہاں نہیں بیٹا۔ ہم تیاگی ذرا
 پرانے خیال کے لوگ ہیں، تو اسے گھر سے جانا، پھر جو جی چاہے
 کرنا۔“

اور گوتم خاموش ہو گیا۔

اگلی سویر گوتم کا باپ اور برات میں آئے ہوئے سب
 آدھی ڈیریا پور جانے کے لئے روانہ ہونے والے تھے۔ پہلے کلکتے
 جانا تھا۔ اس میں بھی ریت تھی کیونکہ بھاتی ہونے کے ناطے دیوبند
 ہی کو مٹی کو ڈولی میں ڈالنا تھا۔ کسی کتاب میں لکھا ہے کہ مرد کو
 نناوی اس وقت کرنی چاہیے جب وہ عورت کو اپنے پٹھوں کے
 زور سے، ایک ہی ماتھہ سے اٹھا سکتا ہو۔ دیوبند رشادی شدہ
 آدمی تھا لیکن اس سے کنوادی بہن کو اٹھایا نہ گیا۔ مٹی یوں اس

سے لپٹی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی کہ اس کے اٹھائے ہونے کا گمان
 ہوا حالانکہ وہ بیچ بیچ میں چلتی جا رہی تھی۔ منی نے ایک ہی مٹھی
 چاولوں کی سر کے اوپر سے پھینکی لیکن داوی جو تھی اس نے پوری
 بوری خالی کر دی۔ پھر ڈولی اٹھی اس سر نے ڈولی کے اوپر سے نئے
 پیسوں کی چھوٹ کی چونکہ وہ خود جا کہ بینک سے دس روپے کے
 نئے نئے پیسے لایا تھا۔ اس لئے وہ ڈولی پر سے گرتے ہوئے سوج
 کی روشنی میں چمک رہے تھے اور بیچ چمک کی چھوٹی چھوٹی مہریں
 معلوم ہو رہے تھے۔ گلی بازار کے بچے پیسے اٹھانے ڈولی کی راہ
 روکنے لگے۔ داوی رو رہی تھی اور بچوں سے کہہ رہی تھی: ”لچو
 شہدہ، جانے دو۔ اسے ڈولی کہ تو جانے دو،“ جیسے ڈولی اب
 بھی واپس آ سکتی تھی۔

داوی کے استاد پر ویوینڈر بچوں کو مار مار کر راستے سے ہٹانے
 لگا۔ ایک چھوٹ اور ہوتی اور لرزرتے ہوئے پیسے سامنے زمین پر
 گمے۔ ویوینڈر کے من کا بچا اُبھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی
 لپکے اور چمکتے دیکھتے ہوئے پیسے اٹھائے اور ان پیسوں کو لگی ہوئی
 مٹی اور وھول سے پیار کر کے جیب میں ڈال لے، لیکن اندر ہی اندر
 وہ مسکرا دیا۔

شیلہ حسب معمول جھوٹ موٹ کے آنسو بہا رہی تھی۔
 اس کے آنسوؤں سے بچے تو گوراں، گلو کی ماں، جھٹا اور ترمیکا
 کے آنسو تھے جو اپنے اپنے من میں چھوڑے، جوڑے یا چھوڑے جانے
 والے بھائیوں اور بالوں کو دیکھ رہی تھیں، پھر ہمنوں کو، بھابیوں
 کو، جیسے سسرال کے سب رشتے جھوٹے ہوں، کیا منڈیاں اور کیا سائیں
 اور کیا سسرے، شادی کے وقت وہ سب کیسے لپک لپک کر رہیں
 میں آ رہے تھے؛

شیلہ کو اندر ایک بہت ہی تسکین، ایک بہت بڑی چھٹی کا
 احساس ہوا۔ جیسی اس کی نظر داوی پر پڑی، جو تھڑے پر کھڑی
 اپنی دھندلی آنکھوں پر ماتھہ رکھ کر ڈولی کو دور ہی دور نگاہوں
 سے ددرا، دل سے ددرا بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ داوی کو دیکھتے
 ہی اس کے ماتھے پر بخور آگئے اور اس نے کہا، ”یہ دوسری ڈول
 نہ جانے کب اٹھے گی؟“

دیوبندر نے داوی کی طرف دیکھا۔ نہ جانے اس کے من
 میں کیا آتی کہ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بولا، ”دماں باا،
 اور پھر وہ بچوں کی طرح چھوٹ چھوٹ کر، بک بک کر رونے
 لگا۔ داوی نے چھاتی میں چھپا لیا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ دیوبندر

نے داوی کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور کسی ڈولی کی طرح
 لے کر چل نکلا۔

منی کیا گئی کو سنیام گلی اور تپلی محلے کی رونق بھی ساتھ ہی لیتی
 گئی، ہر چھوٹا بڑا پوچھتا تھا: ”منی کی کوئی چٹھی آئی ہے یا نہیں؟“
 اور ہمیشہ جواب ملتا: ”آئی تو نہیں پر آجائے گی۔“ چینیے دو چینیے کے
 بعد تو وہاں چٹھی پہنچتی ہے۔“

لیکن داوی رشتہ بھینتر سے ڈری ہوئی تھی۔ وہاں ضرور ہی
 جھگڑے ہو گئے ہوں گے، ضرور انہوں نے میری منی کو گھر سے
 نکال دیا ہو گا اور وہ کہیں جنگلوں میں خاک چھانتی پھر رہی ہو
 گی۔ ان جنگلوں میں جہاں سانپ سانپ جتنی بڑی ہونکیں ہوتی
 ہیں، پیروں سے چٹ جاتی ہیں اور ہولے ہولے یوں خون چومتی
 ہیں کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ بو منی جیسے تھک کر آرام کرنے
 کے لئے، بیٹھتا ہے تو پھر نہیں اٹھتا۔

ضرور منی کو کوئی مشیر چیتا کھا گیا ہو گا، ورنہ مینوں سے چٹھی نہ
 لکھنے کا کیا مطلب؟ اور پھر بیچ میں ایک آدھ چٹھی آہی جاتی جسے
 داوی پہلے دیویندر سے پڑھواتی پھر شامدیاں اور پھر سوکھم ڈاکٹر

سے تب کہیں جا کے اس کی تسلی ہوتی۔ تسلی کہاں؟ اگر منی لمبا خط
 لکھتی تو دادی کو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی رونے رو رہی ہے
 الفاظ جن کا ساتھ نہیں دیتے، اگر چھوٹی لکھتی تو کہتی: دیکھانا!
 میں تو پہلے ہی کہتی تھی اسے کوئی منہ نہیں لگاتے گا۔ کوئی ایسی بات
 ہے جو منی چھپا رہی ہے۔ درد نہ مجھے ایسے دد اکھر لکھ کے بھیج دیتی۔
 یہی ہے نا اپنے دلش کی بیٹیوں کا، مرنی مرنی پر شکایت کا
 لفظ بھی منہ نہیں لاتیں۔ ہے رام اب کیا ہو گا؟ کہیں میں اُدھر
 ڈوبنا پور چلی جاؤں، ایک بار میں اپنی سوہی کو ہنسنے، ہلنے ہوئے دیکھ
 لوں۔ تم سب جھوٹ کہتے ہو، ضرور وہاں کوئی گڑ بڑ ہے۔ پرمیری
 بیٹی کو جس نے تنگ کیا جھگوان اس کا بھی بھلا نہیں کرے گا! میں
 مرنے چاہتی تھی، ہاں، اب اس دنیا میں رہ ہی کیا گیا ہے، لیکن یہ مجھے
 مرنے، آرام سے جانے بھی نہیں دیتی ہے، جھگوان! انسان دینا
 میں جس کو مجھ سمجھتا ہے وہ کتنا برا دشمن ہوتا ہے۔

ادر پھر یہ ہو کیسے سکتا ہے، چھوٹ کی لڑکی سے کوئی پانچ
 فٹ کا لڑکا بیاہ کر لے ادر پھر اسے بسا بھی ہے۔ اب تک تو گو تو
 کو پتا بھی چل گیا ہو گا، اور دادی یوں بات کوئی جیسے شاید نہ بھی
 پتا چلا ہو! وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور من ہی من میں کئی پریشانی

کرتی ہے بھگوان! کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ جب گو تو منی کی طرف دیکھے تو وہ اسے چھوٹی لگے۔

ایک دن جگن ناتھ گھر میں آیا تو کچھ دیر کے لئے محلے تک شامتر اٹھتے ہوئے رہے۔ گھر پہنچنے پر شبیلا سو رہی تھی۔ جگن ناتھ چپکے دیکھے رسوئی میں گیا تاکہ بہو کو جگانہ پڑے۔ انہوں نے اوپر نیچے ماتھ مارے، سر بھی چھپکے سے ٹکرا کر لوہان کیا لیکن کہیں کھانا ہوتا تو ملتا۔ اس بات کا علم نہ دادی کو ہوا اور نہ دیو بند کو، سب یہی سمجھتے رہے کہ شبیلا نے حسب معمول کھانا پکایا ہوگا اور طاق میں رکھ دیا ہوگا۔

طاق میں پانی کا ایک گلاس پڑا تھا جو جگن ناتھ کا ماتھ لگنے سے گرنے لگا لیکن جگن ناتھ نے سنبھال لیا اور وہ سمجھ گیا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پینے کے بعد بولا ”بیرا شکریہ مالک!“

اور پھر وہ اندر جا کر لیٹ گیا۔ پانی اس کے کلیجے کو لگ گیا تھا اتفاق کی بات جگن ناتھ نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوکے پیٹ ہی وہ شامتر اٹھ کر تارہا حالانکہ شاستروں ہی نے شریر کو ہری سندھ قرار دے کر اس کی دکھشا مانس کا یرم دھرم لکھا ہے دراصل

جگن ناتھ تیاگی اداس ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی چیز اس کے
چہرے پر مسکراہٹ نہ لاسکتی تھی۔ اپنی سمجھ میں وہ بھگوان کی
پرستش کر رہا تھا لیکن بھگوان تو سمجھتے تھے کہ وہ انسان کی پوجا
کر رہا ہے۔ اپنی مرحوم بیوی کی، جسے محبت اور صرف محبت کی
وجہ سے وہ پیشا کر رہا تھا۔ لیکن اس پر بھی بھگوان نے جگن ناتھ کی
حاضری لگائی۔ بھگوان جانتے تھے کہ ان تک پہنچنے کے لئے جس
بت کی پوجا کی جاتی ہے وہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا صرف
مجھ تک پہنچنے کا ایک بہانہ ہے۔

پیٹ میں درد ہونے کے باوجود جگن ناتھ دھیان میں بیٹھ گئے۔
جبھی دادی کی آواز آئی۔ ”بیٹیا،“

جگن ناتھ نے اندھیر سے ہی میں منہ آواز کی طرف کر دیا اور
بولے ”ہاں ماں!“

”بیٹیا، کھانا کھا لیا؟“

”ہاں ماں بہت کھا لیا، اب نیند نہیں آتی۔“

”کوئی چور نہ بھکی لاق؟“ ہو کر جگاؤں؟

”نہیں ماں، میں ایسے ہی سو جاؤں گا،“

اور جگن ناتھ ایسے ہی سو گیا۔ وہ ایسی سمدھی میں گیا جس سے

پھر نہ اٹھا۔

سویرے بہت شور مچا، شیلا تو جانتی تھی کہ اس نے جانے
کے سرجی کو کھانا بھی نہیں کھلایا۔ اس لئے وہ سب سے زیادہ
اوپچی آواز میں بین کر رہی تھی اور بار بار اپنے مرے ہوئے سر
کے پیروں پہ سرخ رہی تھی۔ درحقیقت اس بات کا علم شیلا کو
بھی نہ تھا کہ اس کے پتی دیو کے پتا اتنی سی بات پر اتنے خفا ہو
جائیں گے، چھوٹی سی بھول کی اتنی بڑی سزا دیں گے وہ ہرگز یہ
نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں آیا ہوا پنشن کا پیسہ بند ہو جائے۔ پتا نہیں
بھگوان نے کس کی کہنی کی سزا کس کو دی۔ اس کی دھڑکیں دہی،
مہانے، شیلا جسے اس دنیا سے بھیجنا چاہتی تھی وہ تو جی رہی تھی یا
دادی کی وہی حالت ہوتی جو ماں کی ہو سکتی ہے۔ جب ملن ناچھ
تیاگی کو لے جانے لگے، اور تھی اٹھائی گئی تو دادی یہ کہتے ہوتے
بے ہوش ہو گئی:

”ارے بچھے شرم نہ آتی جگنا! میں بوڑھی تیرے کاندھے پر سوار
ہو کر جاتی، تو جوان ہو کر میرے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا ہے۔“
گلی کا ایک آدمی، جو دیکھ رہا تھا، شاہد سے بولا:
”کیا فقرہ ہے، کوئی فلم میں سمجھ دے تو لوگ رد نہ کر پاگل

ہو جائیں۔“

شاہ نے ایک نیکی نظر سے اس آدمی کی طرف دیکھنے ہوئے کہا:
”کیسے لکھ دیں بھائی، اس فقرے کو لکھنے کے لئے بیٹا دینا پڑتا ہے؟“
شیلہ تو سمجھتی ہو گی سسر تو گئے اب دادی نہ بچ سکے گی۔ دادی
کئی دن سکتے ہیں نہ ہی۔ دیوینہ نہ گھر سے نہ گیا۔ اسے دکھانے کے
لئے تو شیلہ کو بڑھیا کی دیکھ دیکھ کر نا ہی پڑتی تھی۔ پہلے تو شیلہ نے
پاٹھ کرنے کی پروا نہ کی لیکن جب اس نے دادی کا زندہ مردہ
گلے پڑنے دیکھا تو پاٹھ بھی کیا لیکن دادی پھر وہیں کی وہیں تھی۔
شاید وہ اس منزل پر تھی جہاں گیتا کے پاٹھ بھی اثر نہیں کرتے۔
ہوش میں آتے ہی جو پہلا سوال دادی نے کیا، وہ تھا:
”منی کی چٹھی آئی ہے؟“

دیوینہ نے دادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پچکارتے ہوئے
کہا: ”نہیں دادی، آجائے گی، تو کیوں فکر کرتی ہے؟“
واقعی وہی ہوا۔ پتا کے مرنے کی خبر منی سو ہی کو ایک ڈیڑھ مہینے
کے بعد ملی جب کہ وہ سنسکار تو ایک طرف ہڈیاں بھی گنگا میں
ہما کی جا چکی تھیں۔ شاید اسی لئے اب بھاگ کر کالے کوسوں سے
ڈیما پورا نا اور آسام کی جو نکلیں لانا بے کار کی بات تھی۔ اور جب

باپ کی موت کے مہینوں بعد تک بھی منی نہ آئی تو دادی نے ہنکارنے
 ہوتے کہا: ”ارے منی ہو تو آئے“ جیسے وہیں کسی نے منی کا گلا گھونٹ
 ڈالا۔ دادی کو دل کی اندردن ترین گہرائیوں سے اس بات کا
 یقین تھا کہ منی اور گوتم کی اصل بے جوڑ شادی کبھی نبھ ہی نہیں
 سکتی۔ منی ابھی لوٹ کے آئی کہ آئی۔ ردتی، چلاتی، سرپیٹی ہوئی۔
 برسات ہو کے مٹی تھی۔ سورج کی گرمی کے راستے میں ایک بھی تو خاک
 ذرہ حائل نہ ہوتا تھا۔ کرنیں زمین کھود کھود کر اس میں سے کھس
 نکال رہی تھیں۔ کچنار کا پیڑ تو سامنے مکان کے سائے میں تھا
 اس لئے اس پہ گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ برسات کی پہلی دیریش،
 اور آخری دیریش بھی، پیڑ پر لگے ہوئے پھولوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی،
 اُنسا اس نے کلبوں کے منہ بھی کھول دیتے اور اب پورا کچنار سنستا
 ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ڈالی سامنے کھتریوں کے مکان کی
 کھڑکی میں جا گھسی تھی جہاں لال شینل کا سوٹ پہنے کھتریوں کی
 بہو کھڑی تھی جسے چند ہی دن پہلے وہ لکھنؤ سے بیاہ کر لائے
 تھے۔ لال لال کپڑے، مخملیں سوٹ پہنے ہوئے وہ پیر ہوئی معلوم
 ہو رہی تھی جو برسات اور اس کے بعد تڑاکے میں سے کبھی
 اپنے آپ نکل آتی ہے۔

شاہد کی بہن، فردوس، منی کی شادی پر تو نہ آسکی تھی، اب تو منی کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اس نے سب کا جینا حرام کر دیا۔ فردوس دادی رمن کے پاس بیٹھی ہوتی ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی کہ گوراں بھاگی آئی۔

”دادی، دادی،“ وہ بولی ”منی آگئی!“

شام گلی پوری کی پوری الٹ پڑی اور منی کو لینے کے لئے آگے بڑھی منی تانگے پر سے اُتری اور گوتم کے ساتھ ڈپٹی بھون کی طرف آنے لگی۔ اب وہ چھ فٹ کی تھی اور اس کے ساتھ اس کا پتی، گوتم جو بچ بچ تو میکا اور گلو کی ماں کے کہنے کے مطابق پہلے سے بھی ٹھکانا اور بونا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں آ رہے تھے ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر، کسی بھی احساس ذات سے عاری۔ جی بھی منی اپنے گھر کے پاس پہنچی تو دھب سے ایک ہاتھ اس کے سر پر پڑا تھا۔

”بچی موتی، بچی۔“

اور منی نے ہلکا کر دیکھا۔ دادی تھڑے پر کھڑی تھی اور اس کا عضو صنوکاں پ رہا تھا۔ منی نے ایک ایک کی چلاتے ہوئے کہا: ”وہ ی ی ی ی۔“ اور اس سے لپٹ گئی اور بھینچتے ہوئے بولی: ”بابو

کہاں بھیج دیتے دادی؟
دادی نے جگن ناتھ کے ہارے میں کچھ نہ سنا، بولی:

”گوتم آیا ہے؟“
جبھی گوتم نے آکر دادی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔
دادی راقن نے منہ قریب کر کے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور
بولی: ”جیتے دہو، جیتے رہو بیٹا، پر ماتا...“ اور پھر اندر کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی، ”آؤ، آؤ! میں داری، آؤ!“
ماتم تو کچھ ہی دیر میں ختم ہو گیا۔ دراصل ماتم بھی اور اس ہو
گیا تھا اور اب ڈپٹی بھون میں تھپتھپے لگ رہے تھے۔ صرف
شیلانتھی جسے سسر کی موت کے بعد اتنی جلدی ہلنا اچھا نہ لگتا
تھا۔

دادی نے دیکھا: مٹی خوش، بہت خوش ہو رہی تھی۔ گوتم،
اس کی ماں، اس کا باپ اسے ہاتھوں سے چھاد لے کر لے گئے تھے۔
ہاں، چھاؤں کرنے کے لئے انھیں بیڑھی ضرور لگانا پڑتی تھی
دادی کو یہ بھی پتا چلا منو کو ساتواں مہینہ ہے!
گوتم جتنے دن بھی رہا بہت خوش، بہت ہنستا رہا۔ وہ دادی
کے ساتھ مذاق کرتا رہا اور دادی اس کے ساتھ نہ لبے ہوئے

کی بات سامنے آئی نہ چھوٹے ہونے کی، اور پھر وہ منی کو زچگی کے لئے
 مائیکے چھوڑ کر دادی ماں کے پیچھونا ہوا چلا گیا۔

دادی کی بیماری لوٹ آئی، اب وہ خوشی کے مارے مر رہی
 تھی، ایک تسکین، ایک تکمیل کے احساس کے ساتھ جا رہی تھی۔
 ایک دن رات کے دو بجے کھانسی جو آتی تو کتنی دیر تک دم ہی
 والیں نہ آیا۔ شیلہ اور منی پھر دوڑیں۔ شیلہ تو اب ان سب باتوں
 کو بے کار سمجھتی تھی لیکن منی سوہی کا جھگوان پر پورا دشا اس تھا
 اس نے گویاں کی مدد سے دادی کو نیچے فرش پر اتارا اور اس
 کے کان کے پاس منہ کر کے بڑی شروہا کے ساتھ صرف گیتا
 کا سترھواں ادھیاتے بلکہ جہانم بھی پڑھا اور اس کا پورا پھل
 دادی کے منت دیا۔ لیکن دادی ابھی تک جی رہی تھی اس
 کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی نورانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی،
 پھر بچوں کی سی شرارت چلی آئی۔

اس نے مر گئے سے انداز میں دانتیں اود دیکھا جس طرف
 منی بیٹھی تھی جو گیتا کو نپاتی پر دیکھتے ہوئے بڑے غور سے دادی کی
 سبک سی پرواز دیکھ رہی تھی۔

»منی« دادی نے نجیف سی آواز میں کہا

”ہاں دادی ماں، منی بولی اور دادی کے منہ کے پاس کان کر دیا۔
 دادی نے کچھ کہا۔ منی ایک دم شرما ئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ شیشلا
 پاس کھڑی تھی، ہاتھیں طرف گوراں۔
 ”دکھا پوچھا دادی نے؟“ گوراں بولی۔
 ”کچھ نہیں۔“ منی نے کہا اور پھر اور بھی شرما گئی، رنگ لال
 ہو گیا۔

گوراں نے صند پر کھڑکی تو منی بولی: ”کہہ رہی تھی، ہاتھیں منی
 وہ بچہ سے پیار کیسے کہتا ہوگا؟“
 اور پھر سب نے مڑ کر دیکھا: دادی رنمن جیسے پہلے مسکرا
 رہی تھی ویسے ہی اب بھی مسکرا رہی ہے۔
 اس کے بعد دانہ دن میں ہوا کا تو پہل ہو گیا اور نیالی پر
 پڑی ہوتی گینا کے پنے اڑنے لگے اور اڑنے اڑنے دیاں آگے
 رگ گئے جہاں شبہ سمایت لکھا ہوتا ہے!

دیوالہ

روپ متی، میری مندا، جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی کا ثبوت
شہر یہی نہ تھا اس کے لچھن بھی تھے، وہ اس کا چونک کے بات
کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے سبب کی دلگیری، بدگمانی اور ہمسرے سے
بڑی بات۔ خواہ مخواہ کی رازداری !

مجھے یہ دنیا کبھی اچنبھے کی بات نہ معلوم ہوتی اور نہ ہی اس
میں کوئی بہت بڑا بھید دکھاتی دیا۔ ماں! بارہ ساڑھے بارہ کی تھی
جب بالپونے کالونیٹ سے مجھے اٹھا لیا اور شادی کر دی۔ ادھر
شاوی ہوتی ادھر میں مندروں کی اس لہتی، دیولنگ، میں چلی آتی
یہ نیچے چوڑے گچ میں جو گول گول شیشے ٹنگے ہیں اور ساج کی لکڑی
کا بڑا اچھا ٹک ہے، سب جی بنادیا تھا، ماں، لوہے کے یہ موٹے
موٹے سہل بعد میں گاڑے تھے اور دروازے پر گینش جی کی مورتی
یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی۔

میں یہیں ہوا محل کے اس بخارچے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا لکھوٹا ٹھکے خور بڑ لگ رہا تھا۔ مگر سر جھینڈے وغیرہ سبھی پڑھی پڑ گئے ہوئے تھے۔ دوا بھی مندر سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ بھی ستر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتا تھا۔ دس بھر کی ازبڈی قابو میں کرنے گئے ہیں، ایک باز قابو آگئی تو اپنا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر جاتے گا اگرچہ بہت سوں کے دیوانے نکل جائیں گے۔

کھانا پیتا گھر، یہاں سبھی فیشن کے طور پر کام کرتے تھے۔ کھاتی دیکاتی کے علاوہ اور کیا تھا؟ صبح ہوتی تو ہم سوچتیں، کیا کپے گا، ہو پیر تھوڑے سے کپڑے ادھر ادھر پھینکنے کے بعد شام کیا کپے گا؟ کوئی پوچھے گھوم پھر کے ادھر اور ادھر ہی پہنچنا ہے تو واو بلا کیسا وہی روز کی باتیں، روز کے پھرے اس میں دیکھنے میں ہمیں نہیں لیکن کبھی بھنگن ہی اس سے اچھی لگنے لگتی، اس لئے جب گھر بھر سے جی اوب جانا تو میں یہاں آ بیٹھتی۔ تم نے دیکھا ہے نابالوں کی ماں پر بخار چاچے سے یوں ہی سالگتا ہے۔ مگر ہے رانا تن کا پشپ بول ایک آٹھ کلایا کل، لال سینٹ کا، جسے تھامے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف بیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آ رہا دکھائی پڑتی ہے۔ بھنگی، چمادہ کھا دے نئے کارخانے میں کام کرنے والے محوروں

گریب پر بدن میں محنت کا سرور، چہرے پر صحت کا نور، سیدنا نے
 ہونٹوں پر معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوٹنے جا رہے
 ہوں، اس بات کی بھی پروا نہیں مجوری ملے گی یا نہیں ملے گی، پھر اگے
 والے، جن کی چھاتی کے تسنوں میں گالیاں ہی اُبلتی رہتی ہیں۔ دوسروں
 کو تو کم ہی دیتے ہیں۔ اپنے جانور کو زیادہ، اپنے آپ کو سب سے
 زیادہ اور اس پر بڑے خوش، مارا ماری کرتے جا رہے ہیں نیز
 نیز، جیسے سویرا پورب سے کر نہیں پھینکتے اُٹتا ہے۔ ادھر چھانٹا،
 ادھر چابک، یوں لوگ ادھر ادھر جھاگتے ہیں۔ جیسے رات کا اپر
 ادھر دن ہوتے ہی کوٹھڑیوں، میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں
 جا چھپتا ہے مینیم، دلال سٹی دھوٹی کا پلو سیٹھے ہوئے ایک طرف
 ہو جاتے ہیں۔ مگر جو بیچ مٹک کے جا رہی ہیں تو اپنی لاتینیں، ہر
 وقت بیٹھے رہنے کے جن کے پیٹ میں ہوا پیچھے نافس کے لوٹے
 چلے آئے ہیں۔ جیسے کسی نے بڑے نیگے باندھ دیتے ہوں۔ چلتی ہیں تو
 پیچھے سے بدھ دیر باندھ دیر، کا کا جاپ ہوتا ہے۔ برات کبیر کی ماتھ میں
 پانڈے جی ماتھ میں۔ دینا جہاں سے بے خبر، برائے نام گھوگھٹ
 کاڑھے پتا نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں۔ بڑے سے بڑا لوہے کا
 ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا۔ پھر اپنی جات

برادری کے سیٹھ، جات باہر کے جو پارسی جن کی ہڈیوں تک میں
پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ رانوں کے ٹھیلیاں جن کی طنا میں تک کمر میں
بندھی دکھ رہی ہیں۔ بس پہ بھی چھو کر یوں کو گھوڑ رہے ہیں گھوٹے
مشتدے بھی ہیں۔ لیکن ایک کی نگاہ میں پل پڑنے والا پیارا اور آشنا
دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشا۔ چھو کر یاں بھی تو ان سے
نہیں شرماتیں۔ شرماتیں کن سے؟

ایسی باتیں دیکھ کے جی اور بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر سامنے دیکھ
لیتی ہوں، پورا مار واڑ نظر آتا ہے۔ پتھر ہی پتھر، بالو ہی بالو۔
سورج کی روشنی آٹھی پڑتی ہے تو بالو کی کئی کئی دنگ اٹھتی ہے
معلوم ہوتا ہے ان گنت مہرں پڑی ہیں۔ اٹھا لو اور اندر باہر سب
بھرنو۔ دیں بھر کا سونا روپا اسی دھرتی میں چلا آیا ہے۔ بس یہی جھوٹی
چمک دنگ ہے۔ ہر مائی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کوئی جھاڑی یا کسل
دوب دکھاتی دے جاتی ہے۔ لیکن رخت نام کو نہیں۔ دور دراز صبا
کے آنگن میں کوئی ٹینا کا پیڑ کھڑا ہے یا چمبل کے کنارے بجاسل
سرلا رہا ہے۔ وہ بھی نیچے سے ٹنڈ منڈ، اوپر ایک گچھا سا ہے۔
وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب
سونالے لے اور ہریانی دے دے۔

مان مٹی، میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں بیٹھنے سے منع کرتی ہے۔
 لیکن جب بھی میں یہیں بیٹھتی ہوں، ضد کے ساتھ، ٹھیکے کی طرح۔
 اس کا کہنا ہے۔ ”کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں ہو بیٹی کا۔ کھڑکی میں
 بیٹھتی ہے تو گنگا۔“ میں کہتی ہوں۔ یہی حساب ہے تو ہماری طرح
 کی سبھی گھریلو عورتیں گنگا ویشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ
 ملے تو اس سے مر جائیں۔ ہے نابالو کی ماں؟ کھڑکی کے لئے عورت
 ہونا ہو، عورت کے لئے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اس دن ہمیں کون ٹوک سکتا تھا؟ گوگل اسٹری کا دن تھا
 گوپوں کے کانہہ آج کے دن پیدا ہوئے تھے۔ رادھا بازار میں
 کوئی ہمارا ہی تھی؟ رام رام، ساری لوکاں کی اُمنگ کی طرح باہر چلی
 آئی تھی اور تہنگ کی طرح ناحق، گاتی، بل کھاتی جا رہی تھی۔
 سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بہت تھیں،
 جیسے ان کے بنا سب ادھورا ہے۔ دھکے پڑتے تو برابر امن بناتیں
 اُدھر سے گالیاں دیتیں، مہینتر سے خوش۔ الیسا نہ ہوتا تو باہر ہی
 کیوں نکلتیں؟ یہ عجیب بات ہے، ہم عورتیں جس بات کو پسند
 نہیں کرتیں۔ آخر میں وہی کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ میں غلط کہہ رہی
 ہوں، مگر ہمارے من کا پیارہ انوکھا ضرور ہے۔ مردوں کو اس

بات کا کیا پتا؟ وہ تو سارا پڑھ لکھ کے بھی جانگلو ہی رہتے ہیں بس
 سیدھے۔ فلاں کام کرو، نہیں مار دیں گے یا۔ خبردار جرساوتری
 کے ساتھ منڈوے کو گئیں، وہ اچھی عورت نہیں، ہوٹلوں میں
 جاتی ہے۔ کوئی پوچھے۔ تمہیں کیسے پتا ہے جی؟ بیچارے ہمیں جانے
 کیا سمجھتے ہیں؟ نہیں جانتے جتنی دیر میں ان کے دل میں ایک خیال
 آتا ہے۔ ہمارے من سے میسیوں ہو کے نکل جاتے ہیں۔ ماں تو اس
 دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ جڑت مڑت، انگ بانٹتی
 اور گھنوں کی نمائش تھی۔ سب عجیب سی نظروں سے نیچے بانڈ
 میں دیکھ رہی تھیں۔ پلو سر سے ہٹے ہوئے، چوڑیاں نیچے لٹکی ہوئیں
 یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں جو گھر کے بھیدی نے ٹکا
 رکھی ہیں تاکہ باہر کا چوراہان کے سہارے چلا آئے اور آٹھوں
 کی کھڑکی سے اندر کو دپڑے۔ پھر کیا ہے؟ سامنے بخوری پڑی
 ہے، تالی گھر والوں کے پاس، ہمت ہے تو توڑ لے۔

کہاں تو میں اکیلی بنی بیٹھی تھی کہاں روپ متی، ساس، دوا۔
 سبھی آگئیں۔ جی بھی پتا چلا دوا تو کب سے آئی بیٹھی تھی، کہیں اندر
 کے مندر میں گھنٹی بجا رہی تھی۔ دوا اور ساس دونو باہر دیکھ
 رہی تھیں، چہرے پر کوئی اثر نہیں، منہ سیرنگ لفافوں کی طرح

پیسے دو اور چھڑا لو، نہیں بھیجنے والے کو واپس۔ ہاں، روپو کا منہ
کھلا تھا۔ میں نے کہا۔

”روپو! تو ابھر آ جا اچھی — میرے پاس۔“

بولی: ”نہیں بھابی، میں ٹھیک ہوں۔“

”چھپے سے دو بولی: ”ارے! چار سے بلاتی ہے بھابی، جاتی
کیوں نہیں؟“ روپو نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا
گو یا مجھے اس کی کوئی بات پتا چل جاوے گی۔ میں نے یوں دیکھا۔
جیسے نہیں چلے گی اور وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے جو
اپنی بانہ اس کے گرد ڈرائی تو پتا چلا اس کے کوہے کتنے بڑے
ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی روپو کچھ بھی نہ تھی، اب بھی کچھ
ہے۔ ابھی میں نے اس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی کہ ساس
کی آواز آتی:۔“

”ہو! سر ڈھک اپنا، کیسے بیٹھی ہے؟“

میں نے اسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی۔ میں غمیں
سچ کہتی ہوں بالو کی ماں، مجھے پتا نہ تھا۔ میرے سر پر کپڑا نہیں،
نگلی ہی بیٹھی ہوں ان عورتوں کی طرح جو سامنے بنارپے میں کھڑی
تھیں اور تن من بھی کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ میں پھر دونوں ہاتھ

رکھ، یہاں کھڑکی میں ٹکا، ان پر ٹھوڑی رکھ پیچھے دیکھنے لگی۔
 پیچھے اب عورتیں تو کہیں کہیں تھیں مرد بھی تھے۔ چہوں اور
 کوئی لمبا کوئی ناٹا، کوئی چھوٹا کوئی موٹا، کسی نے داڑھی بڑھا
 رکھی ہے تو کوئی صفا چٹ، کسی نے سر کے بالوں کے پلیٹ
 بنا کندھے پہ پھینک رکھے ہیں۔ کوئی پان کھانا ہے، کوئی بیڑی
 کی رکھ چھکی سے گراتا ہے کوئی لڑتا ہے، کوئی گانی دیتا ہے کوئی
 کھاتا ہے لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں، بجلی کے تاروں کی
 طرف اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے۔ ایک دم یہ اتنے کہاں سے
 چلے آئے؟ پھر میں نے سوچا: آخر ماؤں ہی نے پیدا کیے، آسمان سے
 تو نہیں ٹپک پڑے۔ بیچ میں ایک ٹھٹ سا بندھا تھا اور باقی
 کے سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان کے سروں پہ
 کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسی لٹک رہی تھی جس کا
 ایک سرانگٹروں کے گھراؤ دوسرا چھنڈ ڈالے کے سیٹھ کے
 ہاں سے بندھا تھا اور اس رسی کے سہارے بازار کے عین بیچ
 ٹسکی لٹک رہی تھی۔ یہ وہی ٹسکی تھی جس میں ماما جسدھا مکھن
 رکھ دیا کرتی تھی اور ادھر ٹانگ دیتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ رنٹ
 کھٹ اس تک نہیں پہنچ پانے کا گروہ اپنے ساتھیوں کے

کندھوں پر چڑھ کر پہنچ ہی جاتے تھے۔
 تو اس گہیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے
 کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے
 میں بانہیں ڈال، اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر
 دوسرا پہاڑ آیا، تین آدمیوں کا اور پہلے چھ کے کندھوں پر چڑھ
 کر کھڑا ہو گیا۔ آخر بھیڑ میں سے سانوے رنگ کا ایک جوان،
 لڑکا نکلا اور پھرتی سے باقی سب پہ یوں چڑھ گیا۔ جیسے وہ مڑ
 نہیں بیڑھیاں ہیں، شکہ پر پہنچ کے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی
 قمیض میلی تھی اور اس پہ رنگ گرا ہوا تھا، ہٹن کھلے تھے۔ میں تو
 تم سے سب بات کر سکتی ہوں۔ بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے
 کہہ لیتی ہو۔ میرا دل دھڑک اُٹھا۔ اس لئے بھی کہ اس کے پیر
 ابھی نہیں جے تھے، وہ گرہ بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پیر تھڑے
 اور وہ جھک گیا، اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس
 کے پیر جم چکے تھے۔

لوگوں میں ایک شور مچا گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس
 لڑکے نے سیدھا اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بجلی
 سی میرے بدن میں ووڑ گئی۔ پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں

کے بچے ایک دوسرے میں گاڑ دیتے اور سر کے اوپر اٹھا کر ہاتھ ہلاتے، کانپا، سنبھلا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مومیرے منہ کو آ رہا ہے۔ میری کنپیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے منگی تھام لی۔ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ منگی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام رکھا تھا۔ اس نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ روپو بیٹھی تھی، ساس اور دو بیٹھی تھیں مجھے الیالگا جیسے وہ میری ہی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ جیسے وہ مجھے جانتا ہے، میں نے اسے کبھی دیکھا ہے لیکن جانے کتنی پرانی بات ہے جس میں سمے نے تصویر دھوڑالی ہے، لکیریں سی رہ گئی ہیں۔

میں نے چور نظروں سے روپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی، جیسے بچے تماشے میں کھول کر بیٹھتے ہیں مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا تھا۔ اس میں سے سینک نکل رہی تھی اور اس پاس بیٹھی عورتوں کو لگ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے مجھ سے بڑا ٹھہ رہی ہوگی، مگر کسی نے کچھ کہا نہیں۔

اب تک میری جٹھانی بھی آبیٹھی تھی۔ ایک میں ہی تھی جس
 کے ہاں لاکھ کرنے پر بھی کوئی بچہ نہ ہوا اور ایک وہ تھی۔
 ہر سال جس کے پیٹ میں سے ایک کیڑا باہر چلا آتا تھا۔ اور
 میری جٹھانی کو وہ ہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی
 چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی اور ایک وہ جسے ہر چیز غلط
 سے بڑی مری معلوم دیتی۔ ہر وقت ہاتھ، منہ کپڑے دھوتی رہتی
 خاص طور پر نل۔ اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی
 ہوتی چلی آتی تھی۔ ہاتھ تو لیے سے نہ پونچھے تھے۔ کیونکہ گھر میں
 ہر آتا جاتا اسی تو لیے کو استعمال کرتا تھا۔ اگر اس نے گیلے ہاتھ بھی،
 جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پر پڑے۔ یوں لگا جیسے اوڑنگی دھرتی
 پہ برسات کی پہلی لوہڑیں پڑی ہوں اور جھک سے اڑ گئی ہوں۔
 میں نے مرکزہ دیکھا۔ رو رو جا چکی تھی۔ شاید میرے پاس بیٹھ
 کر اسے سینک لگ رہی تھی یا پھر وہی اس کی بھید بھری باتیں
 کبھی تپا نہ چلا اگلے دم کیا کرے گی۔ اتفاق سے نظر نیچے گئی تو
 وہ ساج کے پھاٹک سے باہر کھڑی تھی اور اشٹی کے جلوس کو
 کو دیکھ رہی تھی۔ جیسی وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر ہٹکی کے
 پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا۔

مگر وہ مشکلی جانے کس مٹی سے بنی تھی کہ ٹوٹی ہی نہ تھی۔ آخر وہ اسے
 کھٹے مارنے لگا۔ جب اس پر نہ ٹوٹی تو اس نے مشکلی میں اپنا سر
 مارنا شروع کر دیا۔ جانے کیا ہوا، میری آنکھیں آپ سے آپ
 بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔
 اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں ٹوٹ لیتی، مشکلی پھوٹ چکی تھی
 اور لوگ شور مچا رہے تھے۔

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو لگی ضرور
 تھی۔ مگر چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی اس
 نے جیب سے میلا کچھلا ایک رومال نکالا اور گردن پونچھنی
 پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اترنے لگا اس
 کے پیر کانپ رہے تھے۔ نیچے کے پرے پر پہنچ کے وہ لڑکھڑا
 گیا وہ گرا میں لپکی مگر بے شمار لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا
 لیا۔ دو انے میری طرف دیکھا اور سنسن دی۔ اس نے تیر چڑھا
 لئے میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو وہ لڑکا کہیں
 بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یونہی مور کھوں کی طرح اس طرف دیکھتی
 رہی جی چاہا نیچے لپک جاؤں اور اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں
 کہیں بہت تو نہیں بچی؟ مگر میں یہاں سے ایک دم کیسے جاسکتی

تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی؟ من کو
 ماد کے بیس بیٹھی اور سوچتی رہی۔

رات آگئی۔۔۔ اٹھنی کی رات۔ میری طبیعت جب تک
 بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ تنکا توڑ کو دھرانہ کیا تھا لیکن اتنی تھک
 گئی تھی کہ بس۔ آج گھر میں ایک ہی چیز کام آئی ہوئی اور وہ یہ کہ
 ادھر کی دال نہ پکی تھی اور نہ اڑوا نہ کڑھی۔ میری جھٹھانی نے ٹھٹھل
 کی وہ پیادہ سبزی بناتی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی بالکل
 مانس کا مزا تھا۔ ناں مابالو کی ماں اتم سے کیا چھپانا، میں نے کھایا
 ہے۔ چوری چوری کٹی ماد کھایا ہے۔

روبو آگئی، ویسے ہی بے وجہ ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے
 اٹھنا دد بھر ہو رہا تھا لیکن وہ تھی کہ اپنے سبک پاؤں پہ
 ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر پھسلتی جا رہی تھی۔ اتنی چمک
 اس میں کہاں سے چلی آتی؟ میری طرف دیکھ کے وہ شرارت
 سے مسکراتی ادھر بولی۔

”بھیا کب آنے والے ہیں جھوٹی بھابی؟“

میں نے کہا۔ ”کیوں۔“

روبا سمجھی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پہ میں شرمنا جاؤں گی!

جیسے دوسری عورتیں اپنے مرد کے نام پر شرمنا جاتی ہیں، مگر ہماری
شادی اب کوئی نئی بات نہ تھی اور شرمانے کی اتنی بات ہی کہاں
رہی تھی۔

روپا بولی روپتا بھی ہے، آج منہ دے ہیں، وہ جھوٹا دیتی
کہ آسمان سے جا لگتیں۔

» او نہ! میں نے بیزاری سے کہا اور چپ ہو گئی۔
روپا جہنم اٹھی کے دن تجھے اور اپنے بھیا کو ہنڈو لے میں
بٹھا کر بڑی خوش ہوتی تھی، پتا نہیں اسے کیا سوا آتا تھا۔
شاید یہ سمجھتی ہوگی۔ دادھے شام کی جوڑی ہے، جب کہیں
لہا اور تیز جھوٹا دیتی تو میں ڈر کر ان سے چمٹ جاتی اور دپا
دیکھ کر بہت ہنستی، بیچ میں میں ایک دوبارہ گر گئی اور یہ مجھے تھما
بھی نہ سکے، میری جھٹانی کے بچوں نے ہر کھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ
پھینک رکھی تھیں ایک میرے سر میں گھس گئی، جب سے میں
نے جھوٹے ہنڈو لے پہ بیٹھنا ہی چھوڑ دیا، بیٹھتی بھی تو ان کا
سہارا لینے کے بجائے اسے تھما لیتی، جس سے روپا کا سب تماشا
ختم ہو گیا۔
روپا بیٹھی رہی اور ہر قسم کی شرارتیں کرتی رہی کبھی وہ

میرا کہ بھجن گانے لگتا، کبھی باجے میں فلم کار بیکار ڈلگا دیتی اور
 نانی بجا بجا کر سانہ ناچنے لگتی۔ آج وہ بدست خوش تھی، جب تک
 ان کے تپا اور بڑے بھائی آگئے تھے ہیں جانتی تھی۔ ددا، ساس
 اور جٹھانی ہنڈ دے دیکھنے کی تیار رہیں کہ رہے ہیں میں سوچ
 رہی تھی اب سانول داس کے دیول جانے کے لئے کہا تو میں
 کیا بہانہ کروں گی۔ جیسی مجھے اس لڑکے کا خیال آگیا جس نے ٹٹکی
 پھوڑی تھی، میں نے بڑے پیار سے روپا کو بلاتے ہوئے کہا۔

”روپو — تو نے دیکھا تھا جلوس؟“

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی،

”ہاں، بھابی!“

میں نے پوچھا، ”اور وہ تہ پانی دیکھی تھی؟“

روپا بولی، ”ہاں۔“

”اور وہ لڑکا؟“

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر اقرار میں وہ اتنی جلدی
 میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کہہ پاتی، اس نے تیرہویں نظر مجھ پر پھینکی،
 اور چپ کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی، البتہ میں ہی پوچھنے لگی۔ ”کون لڑکا بھلا؟“

روپہ نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا ”مجھے کیا معلوم؟“

”ارے دہی“ میں بولی ”مشکی پھوڑے“

اور صرف روپہ کو چھڑنے کے لئے میں نے کہہ دیا ”کیسے تمہاری طرف دیکھ دیکھ کے ہاتھ ہلاتا تھا، اشارے کرتا تھا، جیسے اچھی طرح سے جانتا ہو“ میں چاہتی تھی۔ روپہ مجھے چھڑے، مجھے کہے وہ بتیں بلارہا تھا، بھابی! مگر روپہ چپ رہی۔

نہ صرف چپ، اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا جیسے میرے اندر کی کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لئے تو میں بھی گھبرا گئی، پر میں نے سوچا، میں نے کیا کیا ہے۔ بو خواہ مخواہ کی چورہنوں؟ میں نے دلیری سے روپہ کو اور بنانا شروع کیا جب وہ بہت گھبراتی تو میں سمجھی اس کی تو عادت ہے مجھے کیا پتا۔ آج کیا ہونے والا ہے میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوتے کہا ”کیسے صرا دار کے مشکی پھوڑے تھی اس نے؟“

روپہ اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ میں نے دیکھا پہلوے اس کی دھوئی پیٹی ہوئی تھی اور اس سے پسے کچھ خون کے دبے تھے۔ روپہ ایک سال سے رجسولا تھی، میں نے کہا، وہ پھر

شروع ہو گیا ہے اور یہ پھوٹ نہیں جانتی،
 ”دھوتی تو بدل، کیتا“ میں نے لفظوں کو تھوڑا اچلتے ہوئے
 کہا، ”بھٹی پڑی ہے، سب ہونگا ہے۔“
 روپا کچھ مڑی اور دھوتی میں بھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں
 کو چھپاتے ہوئے ہٹ بٹا کر باہر نکل گئی۔

میں نے اس واقعے کو کوئی خاص وہ نہ سمجھا۔ ایسا تو قریب قریب
 ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہولے ہولے
 وہ اپنا آپ سنبھالنا سیکھ لیتی ہے۔ کئی جب بھی پھوٹ رہی رہتی
 ہیں۔ میں نے سوچا، یہ بھی پھوٹ رہی رہے گی۔ روپا!

رات جو کچھ ہوا اس سے مجھے پتا چلا یہ سب جاو کیتا کے بند
 نے جگایا ہے مجھے کیا پتا بالو کی ماں۔ تو تو جانتی ہے ہم پونہ پیار
 سے بھی ایک دوسری کو کیتا کہا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا؟
 ہم منڈولوں پر گئے۔ روپے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے
 ویس میں کیا کمی؟ کچھس لوگ، پیسے پیسے کے لئے مرنے والے
 شادی بیاہ، تیج تو مار پر حب کو نول کھدول میں پڑی دولت
 اٹھالانے ہیں اور بیچ چور ہے پر رکھ دیتے ہیں، گویا کہہ ہے
 ہوں۔ دیکھو، دیکھو اور جلو میں کیرت داس ہوں۔ جس کی دھن

باد میں نین کوٹنے کی کانیں ہیں، کلکتے ہیں، بڑا اور پلا شک کا سب سے بڑا کا دفنا، بمبئی میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روتی سے بھرے پٹے ہیں۔ تو سانول داس کے دیول میں لاکھوں کا چڑھا دا چڑھ گیا میرے سسر نے مودنیوں پر سونے کا پنزا جڑوا دیا اور شام سند کی آنکھوں میں بڑے بڑے ٹیلے لگوا دیئے۔

میں اگرچہ تھکی ماری تھی۔ مگر ساتھ چلی گئی تھی، یوں ہی ایک امید کے ساتھ۔ اور کچھ نہیں تو رونق دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے؟ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ دہاں بھیڑ میں دو چار دھکوں کے سوا اور کچھ نہ ملا اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے روپا نہیں آئی تھی سب منت سماجت کرتے رہے مگر روپا نے ایک ہی نہ بکڑی سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے اس لئے ساری پروا کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پروا نہ کی۔

لوٹتے سمے اور گھر پہنچ کے میں نے بار بار سوچا۔ یہ ہی آجائیں مگر انہیں کیا پڑی تھی؟ انہیں تو دس مہر کی انڈی چاہیے تھی۔ دنیا مہر کی دولت پیسے، پیسے اور پیسے کے سوا انہوں نے کچھ سوچا نہ ان کے باپ دادا نے ہماری کتنی خواہش ہوتی ہے، بالوں کی ماں ہم اپنے پی کے ساتھ باہر جاتیں۔ میں تو کہتی ہوں۔ اس بات

میں جی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ خیال ہوتا ہے کہ باہر جاؤں
اپنا آپ دکھائیں، اور جب کوئی بہت دیکھے تو اپنے ہی مرد
کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور کہیں ”بھگوان نے سب دیا
ہے، غم کیا سمجھتے ہو؟ غم بیٹھو، ٹھنڈی سائیں لو۔ آئیں بھرا جلو
مرد۔“

ہاں، اتنا ہار شنگار، زبور کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ اسی لئے
ناکہ کوئی دیکھے مگر ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس سارے انکار
میں اقرار چھپا ہوا رمن کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے
جو ہر آنے جاتے من چلے کی ہمت کو دکھاتی ہے۔

گھر آنے ہی میں سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازہ
بند کر کے میں نے اپنے سب کپڑے اتار دیئے اور آئینے میں
اپنا آپ دیکھنے لگی۔ کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے پھرتی سجھا کہ
ایسے ہی بستر میں لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا
میں چونک اٹھی۔ ”کون؟“ میں نے پوچھا۔

”ہستہ سے آواز آئی۔“ میں — روپا۔“

میں نے پاس پٹی چادر لیٹ لی اور اٹھ کر دروازہ کھولا
روپا اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی — زار زار رو رہی تھی —

آتے ہی وہ میرے قدموں پر گر پڑی اور بولی۔ ”میری لاج رکھ لو،
 بھابی! میں مر جاؤں گی کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہوں
 گی۔“

میری سمجھ میں جب تو کوئی بات نہ آئی مگر ہم عورتیں؟ میں نے یوں
 ہی کہہ دیا۔ ”نہیں، ہمیں کسی سے نہ کہوں گی۔“ اور پھر یوں ہی، یوں
 ہی، ”کہا ہوا؟“ روپا بولی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو بھابی، وہ مجھے جانتا تھا۔“
 ”وہ کون؟“ میں نے پوچھا۔

”اب بنومت“ وہ بولی، ”وہی مشکلی مچھوڑ۔“
 نیراستہ تاس! میں نے دلی میں کہا۔

روپا بولی۔ ”جب بھی مادھا بازار سے گزرتی نا کے پر مجھے مل
 جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا لیکن میں پاس سے گزرتی، برے
 برے منہ بناتی، گالیاں دیتی، لیکن آج پتا نہیں مجھے کیا ہوا میں بھیڑ
 میں چلی گئی، صرف اس کے انگلی اٹھانے پر اور پھر ہم دونوں بھیڑ
 سے نکل گئے اور شومندہ میں چلے گئے۔ جہاں مسافروں کے لئے
 کوٹھڑیاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جا رہی تھی۔ آخر میں نے سوچا بھی
 کہ بھاگ کھڑی ہوتوں مگر مجھے کچھ کرنے نہ بنی۔ اس کے بعد میں

اندھی ہو گئی!“

میں سچ کہتی ہوں بالو کی ماں! میرا سارا بدن کاپنے لگا۔ پہلے تجھے
 غصا آیا، نفرت پیدا ہوئی، پھر سب کچھ جانے کیسے اپنے آپ دھل
 گیا میں جی ہی جی میں اپنی مور کھتا تی پہ ہنسی مجھے جی بھی کیوں نہ پنا چلا۔
 جب میں نے روپو سے یہ سب کہا تھا؟ ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے
 تھے۔ جب روپو نہاتی.... اور آج.... ”اچھا، اچھا تو نکرہ نہ کر
 میں نے روپو سے کہا“ مگر اب تو اچھا آپا سنبھال جہنہ بھرا پنا حال
 بتاتی رہنا، مردی۔ کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ صبح میں تجھے
 میٹھرے اُبال کر دے دوں گی۔ اب تو سودہ بیس، میرے پاس
 کہاں جائے گی؟ اسی کو بھی میں؟ سب سوچیں گے یہ کیا ہو رہا ہے؟
 کون چل رہا ہے اس اندھی رات کے وقت؟

”اور من! میں تیری شاوی کی بات چلاؤں گی تو اُوں آں حت
 کیجور کرنا بھی ہے تو بس دکھا دے کسے لئے، اتنا ہی جتنا ہم بھی
 کرتی ہیں، ہٹکی بھوٹہ بونہی سا ہے کوئی راج مجور اس کا تو سوچ بھی
 حت ریاں، جو بات اچھی نہیں ہے ابھی نہیں ہے اور جو اچھی ہے
 سو اچھی ہے۔ بھگوان نے تو مرد و عورت کو بنا دیا اور حب سے
 دینا بنی ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگتے

رہیں گے، جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں، لیکن وہ بھی ایک راستے پر
 جاتے ہیں۔ یہ نہیں اس گلی، اس بانار سے راستہ کاٹنا اور پکڑ لیا ایک
 دوسرے کو الیا ہو تو یہ دینا، یہ سنسار، یہ دھرتی، یہ آکاش —
 سب نشٹ ہو جاتیں۔ سال کے دن کتنے ہوتے ہیں؟ تین سو بیسٹھ
 ان تین سو بیسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار سورج
 چاند کو پکڑ لینا ہے اور بس، اس لئے انسان نے اس چاند سورج
 کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے شادی کا راستہ اس کے
 سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ شادی ہوتی ہے تب ماں باپ بھائی
 بہن خود لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں پھر
 تو کوئی راجہ ہمارا راجہ، حج دیوان بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اور میں نے روپا کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہن کچھ تسلی
 ہو گئی تھی۔ میرے پاس پڑے وہیں سو گئی۔ نیند نہ آتی تو مجھے پوتھی
 جمائیاں لیتی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پہلو بدلتی رہی کبھی
 کبھی میرا ہاتھ روپا کے بدن پر پڑ جاتا، مگر وہ بے ہوش پڑی تھی۔
 سب کچھ کر مٹن کے ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی اور میں۔

ٹسکی چھوڑ — روپا کے جھپٹا — روپا — آئینے میں اپنا
 بدن یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سو پنے لگی

یہ جو روپا سے کہتی رہی ہوں پرچ بھی ہے اور جھوٹ بھی پرچ اس لئے کہ کوئی قاعدہ قانون تو ہونا چاہیئے۔ یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے سے ملتے پھرتے تو اولاد کون سنبھالے؟ کہنے کیسے بنے؟ اور جھوٹ اس لئے کہ شادی کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے، پھر ہولے ہولے مرد عورت ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر جانے کی بات بھی نہیں رہتی، جیسے کوئی آدمی، ہر سال آجوبایا کرے یا سوسر کی تحصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے پھر سوسری کی گھائیٹوں ہی پر چڑھنے کا سرا ہے، نہیں روح سو جاتی ہے اور ہولے ہولے جسم بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ جیھی تو کسی دوسرے کا ہاتھ لگے تو جسم اور روح دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بیابنا جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے اگر عورت مائیکہ ہی جاتی رہے، چاہے وہ صبر کا مائیکہ ہو یا سو وور سے پر چڑھا رہے کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتی ہو جب بھی تبدیلی قانون ہے قدرت کا ہمیشہ گرجی نہیں رہتی، نہ سردی نہ تپ ہے شکل یکش کی رات کا اپنا جاو د ہے اور کرشن یکش کی رات کا اپنا سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی پھر رنگ ہیں خوشبو میں ہیں، آوازیں ہیں — ان جانی، ان گنت ..

شادی بہت اچھی چیز ہے بالو کی ماں، پر کیا سماں نہیں آیا۔ اس میں تھوڑی سی تندی آجائے؟ یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہے۔ اس چھت کے نلے خم و دندہ ہو گئے۔ یہاں جو بچے پیدا ہوں گے انسان ہی کے ہوں گے۔ مرد باہر کام پر جایا کرے گا، عورت گھر سنبھالے گی، اور بس۔ ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ میرا مراد دیکھو بالو کی ماں جوان باتوں میں سے ایک بھی کسی سے کہو۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے، میں بیوی ہونے کی بجائے ان کی پریتما، موتی تو کتنی خوش رہتی!

ساری رات میں نے جاگ کے کاٹی۔ ساری رات میں سولی پر نگی رہی۔ جب صبح ہوتی تو یہ چلے آئے۔ میں لپک کر دروازے کی طرف گئی، مگر انہیں مجھ سے بات تھوڑی کرنا تھی۔ میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھتی تو بھی کوئی ہے۔ باہر جالے دلے کا کیا ہے؟ ہزار شکل دیکھ کے آتا ہے۔ ہم ہی گھر میں ایک دوسرے کا منہ نکا کرتی ہیں اور پڑے پڑے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ ماتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار کھاؤ تو گرم۔

ارنڈی کا سوداگر! ہمنہ بگڑی تو دیکھو، کیسے پیچ کے پیچ لگے ہیں پڑے ہیں، جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منہ پہ انجن کے کوئلے کا پردہ کھنڈ گیا ہے۔ کوئی جم دوت معلوم ہوتا ہے، پینک کا بھوت! کمرے میں اور کسی کے جانے کی ہمت نہ تھی، سوائے ددا کے ددا گئی تو اسے بولے ”ددا جی اسے کہو کچی لسی کا گلاس بنا دے“، اس ماری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی، لسی بنانے وہی، صدیوں کی عادت پل بھر میں تھوڑی سی چلی جاتی ہے، میں نے جی میں کہا۔ بڑا آیا ہے حکم چلانے، جیسے میں کوئی لوزڈی ہوں، ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں، حکم کی دیر۔ مگر میں نے جلدی سے کچی لسی بنا ڈالی۔ رد پایا بھی جاگتی تھی۔ لپک کے باہر جو نکلی تو گلاس سے ٹکراتی لسی سے میرے کپڑے تر ہو گئے۔ پھر جو بھی تھی بھیج دی۔

میں ممتیں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں! رات تک یہ باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں نکلے۔ آپس ہی میں کچھ کھسکھس کر تے رہے میں نے سوچ لیا یا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتہ نہیں چلتا۔ کسی کی قسمت بنا سکتی ہے یا بگاڑ سکتی ہے ہمارے دل میں کی ارنڈی، تو ریے، مونگ پھلی میں وہ طاقت

ہے جو کسی دوسرے دلہن کی دودھ بالائی میں نہیں، کسان ہل جوتے ہیں، بیج بوتے ہیں، کارخانوں میں مجور محنت کرتے ہیں لیکن ان کی قسمت کے فیصلے ان کمروں میں بیٹھے یہ سیٹھ لوگ کر ڈالتے ہیں جو ہل چلانے میں نہیں، بونے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی باہر آئیں تو آج ذرا ان سے دو باتیں کروں اور کمروں۔ پیسے کے سچا رہو، ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی۔ جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے۔ مطلب کی چیز خرید لیتی ہے اور پھر چل دیتی ہے۔ آگے دیکھو تو ہمارے گھروں میں کیا ہو رہا ہے؟ مردوں، سونے چاندی ہیرے، جوہرات کی کھان میں غم نے ہم سب کو قید کر دیا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں، ہیرے جو ہر تو نہیں کھا سکتیں۔ وہ نکلے، باپ اور دونوں بیٹے، چہرے پر خوشی نہ رہے اور پھر گھر سے باہر چل دیئے۔ ہم عورتیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں آج ارہر میں کچھ کالا کالا ہے۔ دوا آئی اور بولی۔ دارنڈی، میں دس بارہ لاکھ کا گھانا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچری کھلے گی تو داخل کر دیں گے۔

دیوالہ! ایسے کیا دیکھ رہی ہو بالو کی ماں؟ تمہارے لئے
 دیوالہ مر جانے کی بات ہے، ان سیٹھوں کے لئے نہیں، یہ تو
 جتنے دیوالے نکلیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے۔
 ہر دیوالے میں یہ کچھ اور پیسے بھیجے کر جاتے ہیں جس سے لاکھ دلاکھ
 کا فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور
 اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا۔

رات بھر یہ ”مرد لوگ“ نہ آئے۔ دن بھر کچری میں رہے۔
 شام کو میں اسی بنجارے میں بیٹھی تھی۔ سامنے اپنے سسر کر آئے
 دیکھا۔ مگر کی طنائیں ڈھیلی کرتے ہوئے میرے جیٹھ کی موٹے کپڑوں
 والی عینک ناک کی چونچ پر آگئی تھی اور یہ! ان کے منہ پر پتھوڑی
 اور کالک کھنڈ گئی تھی۔

دو سال تک انھوں نے ددپاک کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس
 بے چاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا۔ اشارے اشارے
 میں سب کہہ دیا مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ کوئی امیر گھر دیکھنے
 میں دقت صانع نہ دیا۔ دوپانے اتنے عرصے میں زمین آسمان تک
 ایک نہ دیا۔ اسے اب ہر آدمی مثلی پھوڑ نظر آتا تھا۔ کب تک
 گلی محلے کی نظروں سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر ایک دن

تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپا کو خوب پیٹا۔ چھڑانے میں مجھے بھی
 پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔
 روپا کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا، میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی
 تو رو دیتی، باہر آتی تو رو دیتی۔ میں نے ساس کی منتیں کیں، دادا
 کے سامنے ماتھا رکھا اور کہا: ”کیا یہ ضروری ہے؟ اچھا سا لڑکا
 دیکھو جو کھانا کھانا ہو، باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری میں ہو“
 لیکن یہ کسی ایسے کی تلاش میں تھے جو ان ہی کی جانت برادری کا
 ہو، جن سے پوپار کا رشتہ بڑھے۔ مگر ایسا کون نہ تھا۔ تنہا بھی
 تو بڑی ناک والا، بہت پیسے مانگتا تھا۔ لاکھ دو لاکھ کی بھی بات
 نہیں۔ پانچ لاکھ۔

روپا کھل کھیلنے لگی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ شادی کروں گی
 تو اسی مٹکی بھوڑ سے۔ مٹکی بھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا اور
 وہ اکٹس بازی کی دکان کا مالک تھا۔ آمدنی کوئی اتنی زیادہ نہ
 تھی لیکن دیوانی کے ادھر ادھر اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ سال بھر
 کے لئے کافی ہو، خود شیتل داس تھا۔ مگر کام ہوا تو پٹاخے کا اپنا
 من شیتل ہو یا نہ ہو لیکن دوسرے کا ضرور کہہ دیتا تھا۔ دیول نگریں
 دو چار ہی بانکے تھے۔ جن میں سے ایک وہ بھی تھا۔ ہر کھیل تلے

میں آگے، اس بیلہ کا بند و بسنت اس کے سپرد، وہ مہاجرات
کا گھس تھا تو راسن کاراؤن۔

لیکن روپا اب اسے نہ مل سکتی تھی نہ اسے گوگل اسٹی کے دن
سانول واس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی اور نہ اس
بیلہ، دسہرے میں حصہ لینے کی چھٹی۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر
تس آتا تھا میرے دل میں جانے کیا کراتی کی ہر اٹھی، شومند
جانے کے بہانے میں نے کپڑے پہنے اور چل نکلی شیتل کی دکان
راوہا بازار اور رگھوناتھ بازار کے سنگم پہ تھی۔ جہاں مہا سیرجی
کا مندر ہے اور لال رنگ بکھیرا ہوا ہے، ہر آنے جاتے کو لگتا
ہے۔ کارہیو ہمار پر آنے جانے والے لوگ وہاں ٹھوڑی دیر کے لئے
کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں۔
اور کچھ دیر کے بعد نہ بخیروں سے ملتی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے اور
چل دیتے ہیں۔ سامنے دابیں، بابیں اور پیچھے گاہیں بیٹھی جگالی
کرتی ہیں اور انہیں کوئی نہیں روکتا۔ کمبٹی بھی کچھ نہیں کر سکی۔
کوئی موٹر ٹانگے والا آتا ہے تو رک جاتا ہے اور پھر گاڑیوں کو
ادھر ادھر سے گھما کر اپنا راستہ بناتا اور چل دیتا ہے۔

میں باکرہ شیتل کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اس کی دکان

پر کام کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا اور لڑکوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ دسہرے کے ادھر ادھر کے دن تھے اور شیتل داس نے دکان کے سامنے ایک طیلے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ میگھ ناو اور بھجیشن بن چکے تھے اور اب راون بننے جا رہا تھا۔

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا کہ کیا چاہتے؟ پھل جھڑیاں؟“ میں نے کہا کہ پھل جھڑی لینے نہیں آتی، دینے آتی ہوں۔“ وہ کچھ نہ سمجھا۔ دکان سے نیچے اتر گیا۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا۔ میں پرے منہ کر کے راون کے ڈھانچے کی طرف دیکھنے لگی۔ جس نے طیلے کا تین چوتھائی گھیر رکھا تھا۔ اس سرنگے والے تھے اور ادھر گدھے کا سرنگے سے پورا طیلہ گھر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شیتل داس کے سر کی طرف دیکھا، ہر سال سینکڑوں ٹمکیاں پھوٹنے سے جس پر چھوٹے چھوٹے زخموں کے نشان پڑ گئے تھے پھر میں نے جو کتنا تھا چپکے سے کہہ دیا شیتل داس کا پرہ چمک اٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلا اودل سناپا کرتے تھے اور جسے سن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں

سے ایک تھا جو خجری بجاتا تھا، اور وہ شیتل تھا۔ چونکہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے اس لئے روپا انہیں دیکھ سکتی تھی شیتل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں منہ بھیخ کر منس دی تھی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شیتل کو نہ پہچان سکا۔ پڑوسنیں بھی اسے نہ جان پادیں۔ کجھنت ایسا بہروپا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا ایک پیچا نا تو پیچانے والی نے جو اس کے ایک ایک بل سے واقف تھی۔ روپا اندر پھاگنے لگی میں نے اشارے سے منع کر دیا۔ میں کہتی ہوں، بالو کی ماں، مجھے اس میں ذرا بھر بھی لاج نہ لگی اور نہ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ اُلٹا یوں جان پڑا جیسے کوئی بہت بڑے پن کا کام کر رہی ہوں ہمارے شاستر اس طرف تھے اور ددا، ساس، جھٹھانی، سسر، جھٹھ۔ یہ سب دوسری طرف۔ میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان کے آلا او دل شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا عورتوں میں سے روپا غائب ہے اور مردوں میں سے شیتل۔ باقی کے بھاٹ تلسی جی سے کچھ پڑھتے رہے۔

جب ہنٹ دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اٹھ کے گئی تو دیکھا
 روپا اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی ہے۔ میں نے
 اشارے سے پوچھا وہ کہاں گیا؟ روپا نے بتایا پیچھے سیڑھیوں کے
 راستے سے غائب ہو گیا ہے۔ میں سمجھی بس مل لیا دونوں نے اور کوئی
 بات نہیں ہوتی۔ مگر مجھے کیا پتا بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے
 گھر کے مرد لوگ سبھی پرے چلے آئے۔ میں سوچ کتنی ہوں
 اس روز مجھے روپا کے بھتیجا برے نہ لگے۔ انہیں خود بڑی چرائی
 ہوتی کہ یہ آج اتنا پھسلا کیوں رہی ہے۔ میں بڑی خوش تھی جیسے
 کچھ مل گیا ہے۔ مل بھی جانا بالو کی ماں تو اپنے آدمی کے لئے میرے
 دل میں پیار کم ہو جانا؟ بالکل نہیں، اُلٹا بڑھتا ہی۔ میں سوچتی۔
 میں کیا کر آتی ہوں۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم؟ جو لوگ عورت
 کو جتنی نہیں سمجھتے، بیوی پارھا ٹیڈا کی چیز سمجھتے ہیں، جن کے دماغ
 میں شادی کا وہی پرانا مہنٹو گھسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں
 سال پہلے تھا، انہیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات ددبچے میں ہڑ بڑا کے اٹھی۔ گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا
 روپا شیتل کے ساتھ دوڑ رہی تھی کہ پکڑی گئی۔ میرے ماتھے پاؤں
 ٹھنڈے ہو گئے۔ روپا سے ہر طرح کے سوال کیتے جا رہے تھے

مگر اس نے ایک ہی چپ لگا رکھی تھی۔ وہ ڈھبیٹ بن گئی تھی اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ کہو جو میرا کہنا ہے۔ میں تو وہی کر رہی گئی جو میرے من میں ہے۔

ایک بات اچھی ہوتی جو شیل نکل چکا تھا۔ اس کے پاس میں کہی کو تپانہ چلا۔ وہ ہوتا تو جب کہہ ڈالنا اسے کیا پڑی تھی؟ وہ تو رستیا تھا۔ باقی رہی روپا کی بات، روپا کو کوئی مار بھی دیتا تو میرا نام نہ لیتی۔ وہ اتنی ناشکری نہ تھی۔

اب حب کو ماتھ پیر پڑ گئے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن گھر کے نانی نے بال گھاٹ میں ایک رشتہ بنا دیا۔ ایسے میٹھ کا نام لید جس کے چھ دیوالے نکل چکے تھے، جو بڑوں کا بیوپار کرتا تھا۔ سب کچھ جلدی سے طے ہو گیا۔ روپا کو منانے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ روپا کچھ مانی کچھ نہ مانی اور دونوں ہی میں برات بھی دروازے پر آ گئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ شیل تو اس کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔ یہ جوان، خوبصورت، لمبا جوڑ میں رہا کے پاس بھاگی گئی اور اسے حب بنا دیا۔ روپا مسکرا دی — ایک روکھی پیکی مسکراہٹ میں تو ناچ اٹھی، جیسے روپا کی نہیں

میری شادی ہونے جا رہی ہے !
 تم نے تو وہ شادی دیکھی ہے، بالوکی ماں؟ وہ شادی دیول
 نگر میں یادگار رہے گی۔ ان کے پتانے دی ہی کیا جو ہماری جات
 برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس
 نے نہیں کھایا؟ کون لاگ لے کے نہیں گیا؟ ہمیں وار کرنے،
 چھڑنے کی پوری برات ملی اور پھر وہ — ددہوں کا ددہا۔ وہ
 ہنگامہ ہوا، وہ شور مچا کہ بس، بنیڈ، باچے، گائے، مردشیاں میری
 جھٹانی کے بچے خوش تھے۔ میں نے بلرام کو بلایا اور کہا۔ ”دیکھ
 ننھے، تیری بوا کی شادی ہو رہی ہے۔“ اس بے چارے کو کیا پتا
 کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا اور کیا ہونے جا رہا ہے؟ وہ خوش تھا
 ہاتھ میں ایک بڑا سا جیسو تنٹا اس نے صرف اتنا سا کہا۔
 ”بس شادی بھی کر دوں گا چاچی۔“
 میں نے کہا۔ ”کس سے؟“
 بوا۔ ”بوا سے۔“

”ہشت!“ ددا جو پاس کھڑی تھی بولی۔
 ڈول گئی۔ دہ آتش بازی چھوٹی کہ رام رام۔ پانچ ہزار کا ٹھیکہ
 میں نے ان کو کہ سن کر شینل کو دلوادیا تھا اور وہ خود کھڑاپے

سامنے چکر چلو رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے۔ ڈوولی گئی! اب گھر میں دونوں ہیلوں کا غد کے پھولوں بیڑا مچھٹے ہوئے غباروں، چلے ہوئے اناروں، چکرؤں کے بالنوں کا سچ کے ٹکڑوں، فرنی کی پلیٹوں کے سوا کچھ نہ رہ گیا تھا۔ جتنا شور مچا تھا اتنی ہی چپ تھی۔

کہیں دو مہینے کے بعد روپا روپا آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ ہی اور تھا۔ لڑکے نے اسے اور اس نے لڑکے کو بے حد پسند کیا تھا۔ روپا کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکنتے تھے۔ اب میں اس کے سامنے یہاں کے ٹھکی مچھوڑ کا نام لیتی تو روپا خود ہی منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ میں نے روپا سے کہا: ”روپا! دیکھا... میں نہ کہتی تھی؟“ روپا بولی: ”اور تو کوئی بات نہیں بھابی، یہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، مگر دلو بہت ہیں۔ گھر میں کمانے والے میرے سر ہیں اور ان کے بڑے بھائی، اس لئے ہر چھوٹی بڑی بات کے لئے انہیں ان کے سامنے مہر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر تجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں۔“

”اور وہ تمہارا...؟“ میں نے شرارت سے پوچھا۔

”وہ تو کچھ نہیں چاہتے، بس۔۔۔“ روپانے کہا اور میری طرف دیکھ کے ہنس وی اور بولی، ”بہت دہ کر وگی جھابی تو ماروں گی، ماں“

میں مارے خوشی کے رو دی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے رونا پڑ جائے گا۔ مائے یہ مرو اور پا چاہیئے سے یہیں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ وہ رو پیہ مانگتے ہیں اور یہ دیئے پر تیار نہیں۔ روپانے ٹھیک کہا تھا۔ لڑکا دبو ہے۔ بات اتنی ہے کہ اچھی شکل اور جوانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک مرد کماؤ نہ ہو بیکار رہے۔ انہی چند عینوں میں روپا کو بھی رہ گئی ہے وہ بخار پے سے بھی نیچے نہیں جھانکتی۔ حالانکہ دوسرے میسرے رو دیول نگری کا بانکا، شیل آتش باز، پیار کے گانے گانا نکل جاتا ہے۔ کل سو پے میرے سسر آئے۔ بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اس نانی کو گالیاں دے رہے تھے۔ جس نے یہ رشتہ کوایا کہہ رہے تھے۔

”ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے چاہے ساری عمر گھر بیٹھی رہے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ روپا کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا۔“

صرف ایک سگریٹ

سنت رام کی آنکھ کھلی تو صبح کے چار بجے تھے۔

ساتھ کے بستر پر دھو بن سو رہی تھی، ایک پہلو پر دھو بن
سنت رام اپنی بیوی کو کہتا تھا۔ اس کا نام تو اچھا مہلا شانتی تھا۔
لیکن سنت رام اسے اس نام سے پکارتا تھا کیونکہ وہ لائڈری
میں کپڑوں کی دھلائی کے بہت غلاف تھی۔ گھر میں نوکر چاکر پرانا
کا دبا سب ہوتے سوتے وہ رد مال سے لے کر بھاری بھاری چپڑے
تک گھر ہی میں دھوئی تھی۔ جب ٹھک جاتی تو سب سے لڑتی اور
لائڈری کے خرچ سے بہت مہنگی پڑتی۔ پھر رات کو سونے سے
پہلے وہ ہمیشہ دبائے جانے کی فرمائش کچھ اس انداز سے کرتی
کہ فرمائش اور حکم میں کوئی فرق ہی نہ رہتا دبائے کی اس مصیبت سے
سنت رام تو کیا دھو بن کے بچوں تک کو چڑھتی۔ کوئی پانچ بنیں
تو حد دس حد تک دہوائے لیکن یہ کیا کہ کوئی گھنٹے بھرے ادھر

چھوڑنے کا نام ہی نہ لے۔ عجیب تماشا ہوتا تھا۔ آخر وہانے والے
 کو خود بے دم ہو کر لیٹ جانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑی بیٹی لاڈو
 کے ساتھ یہی معاملہ تو ہوا۔ ماں کو دبانے کے بعد وہ ہانپتی ہوتی
 پینگ کے ایک طرف جا گئی اور لولی۔ داب تم مجھے دبا دو، مئی“
 پھر اس دبانے و دبانے کے سلسلے میں ایک اور بڑی مصیبت
 تھی۔ دھوبن کے پتا ہی نہ چلتا تھا کہ اسے درو کہاں ہو رہا ہے۔ جہاں
 ہاتھ رکھو درو ہمیشہ اس سے تھوڑے پرے ہوتا تھا اور یوں جگہ
 لڑھنڈواتے وہ سارا بدن دلو لیتی تھی۔ کوئی کہے یہ اس کی چالاکی
 تھی تو ایسی بات نہ تھی۔ اسے واقعی پتا نہ چلتا تھا اور آخر پر فیصلہ
 ہوتا کہ سارا بدن دکھ رہا ہے، اچھا، دھوبن کو دلوانے کا ہی
 نہیں دبانے کا بھی شوق تھا۔ اشارہ کرو اور وہ تیار۔ البتہ یہ کام
 اسے کوئی کم ہی کروانا تھا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ کیا تھا۔ مستری
 کی پیکر تھی جس سے وہ اچھے بھلے آدمی کے منٹ ہولٹ کس دیتی
 تھی۔ اس کے بازو دل کی گرفت نہ صرف مردانہ بلکہ سپلاؤ نہ تھی۔
 یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی کو نہیں دبا رہی بلکہ بیڈ کو رہ
 پنچوڑ رہی ہے۔ سنت رام تو اس کے دھوبی پٹرے سے بہت
 گھبراتا تھا۔ دھوبن — ماں، سنت رام نے اس کا یہ نام اس

لئے بھی رکھا تھا کہ بچپن میں اس نے سیر بہن میں بارہ من کی
 دھو بن دیکھی تھی۔ جو نیم برہنہ حالت میں پیلو پہ لیٹے، ہاتھ میں مور
 کے پروں والا نیکھالیٹے ایک بھر پور عورت معلوم ہوتی تھی۔ سیر
 بہن والا اپنا ڈبے پہ گھنگھڑ بجاتا ہوا گلی میں آتا تھا اور آواز
 دیتا تھا۔ ”پیرس کی رات دیکھو، اپنی بارات دیکھو۔“ اور پھر
 ٹیون بدل کر، ”دھو بن دیکھو بارہ من کی، گوری چٹی آہاتن کی رہا“
 اور سب بچے ماؤں سے ایک ایک پیسہ لاکر اس جاو کے بکس
 والے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنا اپنا چہرہ اور آنکھیں سیر بہن
 میں ٹھونس لیتے تھے اور نظاروں سے پورا پورا لطف اٹھاتے تھے۔
 پیرس، بارات، سفید رچھ، سرکس کے جوکر کے بعد جب دھو بن
 آتی تھی تو بچوں کو کچھ تپانہ چلتا تھا۔ وہ سوچتے۔ دھو بن کیوں اس بکس
 میں قید کر رکھی ہے؟ مہینہ پہلے بھی وہ ایسے ہی لیٹی ہوتی تھی اور
 آج بھی لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پیلو پہ لیٹے لیٹے کیا وہ تھک نہیں جاتی؟
 دھو بن ایک نامحسوس طریقے سے بچوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ دماغ
 میں گھس جاتی تھی اور کہیں پندرہ بیس بیس کے بعد باہر نکلتی۔
 ساتھ کے کمرے میں لاڈو، سنت رام کی شادی شدہ لڑکی
 جو ایک روز پہلے سسرال سے آئی تھی، سو رہی تھی۔ کچھ ایسی

بے خبری میں جیسے اس کا کوئی میاں ہی نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا
 تھا۔ کیوں کہ رات کے پہلے پہر کینے باقی، اس کے بچے نے اسے
 مرنے ہی نہ دیا تھا، اور جب اسے نیند آتی تو سانس لینے کے
 لئے زیادہ ہوا کی ضرورت پڑتی۔ لاڈ و جیسے شادی سے چھ برس
 پہلے تھی۔ ویسے ہی اب بھی بولتی۔ بات کرنے میں منہ سے پانی
 کی بھوار سننے والے پہر پڑتی تھی۔ جیسے وہ روٹھی ویسے ہی من جاتی
 سنت رام اور دھوبن کو یہی فکر تھی، یہ آلی بھولی بیٹی ہماری
 بسے گی۔ کیسے؟ اسے کوئی دشمنی پسند میاں مل گیا تو مصیبت
 ہوگی۔ لیکن اسے میاں جو ملا تو اس نے کوئی شرط ہی نہ پیش کی
 اور نہ اب پیش کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ ادھر اس گھر میں
 ماں باپ کی ناچاچی، ادھر لاڈ و کی سسرال میں والدین کی کثرت
 محبت یا ایسے ہی دینا کے ڈرنے مل ملا کر دونوں میاں بیوی کو
 ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ بہادر دونوں اتنے
 تھے کہ گھر میں چوہا نکل آئے تو یہ چیختے چلاتے ہوئے ایک دوسرے
 کی پناہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ لیکن یہ ڈر اولاد تک منتقل ہو رہا
 تھا۔ لاڈ و کے ساتھ اس کا منا باقی سو رہا ہوا تھا، ماں کے گلے
 میں پانہ ڈال کر جب ذرا نیند کھلتی تو اس کے کان ملنے لگتا۔

سنت رام نے جب بھی محبت کے جذبے سے معمور ہو کر دوہتے کو ساتھ سلا دیا تو تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر اسے اٹھانے ہوئے پھر اس کی ماں کے ساتھ ڈال دیا۔ سوتے میں بانہ لگے میں ڈالنے کی بات اتنی نہ تھی، البتہ جب وہ اپنے لہجے ہاتھوں سے کان مسنے لگتا تو عجیب سی گدگدی ہوتی اور کبھی یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کوئی کنکول کان میں گھس رہی ہے۔

چھوٹے دو بچے لڑکا اور لڑکی، اپنے ماموں کے ہاں گھر کا لڑاں گئے ہوئے تھے۔ ان کے بستر خالی پڑے ہوئے بے کاری کے عالم میں چھت کو تکا کرتے۔ بڑا، پال، بیس تھا، جس کے خرٹے سنائی دے رہے تھے وہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہو گیا تھا اور سنت رام کے تسلط سے نکل گیا تھا۔ سنت رام نے اپنے بیٹے پال کے سلسلے میں اپنی زندگی کا آخری چاٹا کرتی چھ برس چلے مارا تھا جو اب تک گھس چکا تھا۔ اب تو وہ اس سے ڈرنے لگا تھا۔ آج بھی پال حسب معمول رات کے دو بجے آیا تھا۔ ڈپلومیٹ کے دو چار پیگ لگا کر وہسکی کی اصلی مہک تو گھر کے لوگوں نے مینڈ میں گزار دی تھی۔ لیکن اب بھی اس کے اُلٹے سالن میں سے بد آ رہی تھی۔

پال چھبیس ستائیس برس کا ایک دُبلّا پتلا نوجوان تھا۔ اندہی اندر کڑھتے، کھولتے رہنے سے اس کے بدن پر بوٹی نہ آئی تھی۔ اس کے باوجود چہرے کی بناوٹ اور مونچھوں کی ہلکی سی تھرپر کے ساتھ وہ مرد کے طور پر قابل قبول تھا۔ عورتیں اسے بہت پسند کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ ان کے بچوں کو بہت پسند کرتا تھا۔

کردار کے اعتبار سے بال اُمنگ بھرا تھا اور جاہ طلب اس میں انا ہے پناہ تھی۔ یہ انا جس کی وجہ سے اس کی ناک کے نتھنے پھٹے جاتے تھے اور وہ بڑے زوردار طریقے سے اپنے آپ کو پال آئند کے نام سے متعارف کراتا تھا، جیسے وہ کوئی روایت ہو۔ یہ روایت اس نے کہاں سے پائی تھی؟ اپنے باپ سنت رام آئندہی سے ناچو ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک تھا اور جس نے اپنے بیٹے کو شہزادے کی طرح سے پالا تھا؟ اس کی مال، دھوبن، کی چوری سے رفیق دی تھیں اور اس عمل میں اپنی بیوی سے اپنے تعلقات خراب کر لیے تھے۔ پھر اس نے پال کو عافیت کی چھت دی تھی۔ ایک ایسے مکان کی چھت جس میں تین بیڈ روم تھے اور ایک شاندار ڈرائنگ روم جس میں استادوں کی پیٹنگز تھیں۔ پھر دن میں دودو بار بدلنے

کسے لئے کپڑے۔ یہ سب اپنے باپ سے لے کر وہ کہیں اسے بھی
 بھول گیا تھا؟ صرف یہی نہیں، اس سے نفرت کرنے لگا تھا اور
 یوں پاس سے گزر جانا تھا جیسے وہ اس کا باپ نہیں کوئی اور
 ہو۔ اگر حکومت نے کوئی نیا قانون پاس کر لیا جس سے کمپنی فیل
 ہو گئی تو اس میں سنت رام کا کیا قصور؟ زندگی میں نفع ہونا
 ہے اور نقصان بھی۔ یہ کیا مطلب کہ نفع کے وقت تو سب
 شریک ہو جائیں اور نقصان کے وقت نہ صرف الگ ہو بیٹھیں
 بلکہ کالیاں بھی دیں؟ لیکن اس میں پال کا زیادہ قصور نہ تھا۔
 وہ آج کل کے زمانے کا لڑکا تھا اور صرف اس کی عزت کہہ
 سکتا جس کے پاس پیسہ ہو یا اس کے ڈھیر سارے پیسے بنانے
 بلڈ نگیں کھڑی کرنے اور امپالہ کا خریدنے کا امکان ہو۔ ایک
 بار سنت رام کے سوال پر پال نے یہ بات کہہ بھی دی جس سے
 بوڑھے کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا، اسے
 اس کا خود بھی اندازہ نہ تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا کہ وہ کہیں چوری
 یاری کر کے ڈاکہ ڈال یا بینک ہو لڑا پ کر کے لاکھ روپیہ بنائے
 اور اسے بیٹے کے پاؤں میں پھینک کر اس کی اور اس کی ماں
 کی نظروں میں اپنی کھوئی ہوئی توقیر سمیٹنے سے حاصل کر سکے جب

خسارہ ہوا تو دھوہن یا لاٹو یا پال میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہ کیا
 اسے جی یا پیپا کو قتی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ جی میل کپڑ
 کرتے ہیں؟ جیسے کھویا ہے۔ ویسے ہی پا بھی لیا جائے گا۔ جو
 پیسہ بنانے نکلنے نہیں کھو بھی دیتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر
 نقصان اٹھانے والا بے دتوف ہوتا ہے یہ تو وہی بات ہوتی۔
 جیسے ہر پیسہ بنانے والا عقل مند ہوتا ہے۔ کیوں سب نے اسے
 بوڑھا اور سٹھپایا ہوا سمجھ لیا اور بیسیوں بار اس کی طرف دیکھے
 بغیر پاس سے گزر گئے تھے اور اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ
 وہ اس دنیا میں اکیلا ہے، اس کا تو یہی مطلب ہوتا تھا کہ اگر پھر
 سے اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے تو وہ ان گزری ہوئی سب
 باتوں کو دل میں رکھ کر ایک ہنٹر ہاتھ میں پکڑے اور کسی بھی غایت
 سے پہلے بیوی اور بچوں کو مار مار کر نیلا کر دے۔ نہیں، یہ شوہر اور
 باپ کا تو روبرو نہیں، لیکن یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ باپ کا کردار
 پیار دینا ہی ہے، لینا نہیں، گویا اسے پیار کی ضرورت ہی نہیں
 ہوتی۔ پیار کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ ایک سال کے بچے کو ہوتی
 ہے تو سو سال کے بوڑھے کو بھی اور تو اور اپنے کتنے جی کر بھی ہوتی
 ہے ہوا اس وقت کہیں اپنے ڈربے میں پڑا سو رہا ہے اور بیچ

بیچ میں کہیں سے کوئی آواز آنے پر بھونک اٹھتا ہے۔ کہیں پیار کی نظریں اس کی نظروں سے ملتی ہیں تو ایک پیغام اس کے دماغ سے دم تک چلا جاتا ہے جو نہ صرف خود بے ستا تھا، ہلکتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ سارے بدن کو بھی ہلا ڈالتی ہے جس دن اسے کوئی ایسی نظروں سے نہ دیکھے وہ کھانا چھوڑ دیتا ہے گویا کہہ رہا ہو، میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن پیار کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہاں دھوہن، لاڈو، پال نے اسے جی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

شاید یہ سب اس لئے تھا کہ سنت رام نے زندگی میں صرف دینا ہی سیکھا تھا اور اب یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا، لینے میں اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اسے کا دوبارہ میں خسارے کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ وہ اب دے نہیں سکتا اور جب گھر کے لوگ چپکے میں پاس سے گزر جاتے تھے تو وہ ان کی خاموشی کا عجیب الٹا سیدھا مطلب نکالتا تھا وہ نہ جانتا تھا کہ لینے والوں کو بھی عادت پڑ سکتی ہے۔ لینے کی۔ مگر اس سلسلے میں سنت رام بہت سفاک واقع ہوا تھا اس نے

کئی بار اُدھالے کر بھی بیوی بچوں کو تجھے دیئے جو انہوں نے
 لے کر رکھ لیتے اور بے شعوری کی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے
 لگے۔ کسی نے شکریے کا ایک لفظ بھی تو نہ کہا اور نہ تشکر کی نظروں
 سے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے کتنے کینے اور بزدلانہ طریقے
 سے اپنی محبت روک لی تھی یا شاید سنت رام کو اپنے گھائے
 کا اس قدر احساس ہو گیا تھا کہ گھر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسے
 اپنے لئے تحقیر کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم
 ہوتا تھا کہ اب وہ اس نفرت اور تحقیر ہی کو پسند کرنے لگا ہے
 اور اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ رحم
 طلب نظروں سے کسی کی طرف نہ دیکھ سکے۔

دھوپ کی چوبیس گھنٹے کی نیکنگ اور نصیحتوں کی سنت
 رام کو اتنی پر وا نہ تھی۔ کیوں کہ وہ ان پڑھ اور بد زبان ہونے
 کے باوجود محنتی بہت تھی اور اپنی صفاتی پسند طبیعت سے بہت
 سی چیزوں کی تلافی کر لیتی تھی لیکن ایک رات بڑھے پیار کے لمحوں
 میں اس نے ہونٹ چرا لٹے کیوں کہ سنت رام کے منہ سے سگریٹ
 کی بو تھی یا شاید دھوپ بوڑھی ہو گئی تھی اور ٹھنڈی اور خشک
 کیوں کہ یہ جوانی اور اس کی گرمی ہی ہے جس میں بو اڑ جاتی ہے

اور روتے نہیں کی سب خوشبوؤں پر چھا جاتی ہے لیکن اگر دھو بن ٹھنڈی اور خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی تو وہ تو خود بھی جوان نہ رہا تھا کیوں کہ اسے اس عمر میں ہونٹوں کی طلب تھی۔ بوڑھے اور بے کیف ہونٹوں کی جن میں رس نام کو نہ تھا ان پر تو صرف جلی کٹی تھیں اور کو سنے جن کے سوا اور کچھ آہی نہ سکتا تھا۔ دھو بن، سیدھی ساوی اور نادان عورت تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ جب ہونٹ چوالیسے جاویں تو مرد پر کیا بیت جاتی ہے؟ سنت رام انہی کی تلاش میں رُل کر ان ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جا رہے تھے ہیں جن پر سوائے سناست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یا شاید دھو بن، سیرین کی دھو بن پر، ”جیف پانہ“ جلا آیا تھا اور اس نے پہلو بدل لیا تھا اور اپنی سیج سے اٹھ کر مور بکھ کر ماتھ سے پھینکتے ہوئے دیکھنے والوں کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی نہ وہ جاو کے ڈبے دال رہا تھا اور نہ وہ معصوم دیکھنے والے یا خود سنت رام پر وہ وقت چلا آیا تھا جب کہ جوانی ایک بار پھر عود کرتی ہے اور آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے پہلے کی سی طاقت کے ساتھ

شعور اور تجربہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور ایک پختگی اور رسبیدگی پا جانے سے انسان خود بھی اپنے آپ میں تعفن پیدا کر لیتا ہے۔ اور تھوڑے پانی والے جو ہڑکی کچ میں بھیئس کی طرح سے لوٹنے لگتا ہے۔ یا خالیا اس کی وجہ بھی وہی گھاٹا تھی جو سنت مام نے اپنے کاروبار میں کھایا تھا اور مالی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ بنانے کا احساس محبت میں غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بدل کر رہ گیا تھا۔

لاڈلہ کی تو خیر کوئی بات بھی نہ تھی وہ تو بیاہی بدمعاش گئی اور اپنے گھر جالسی۔ وہ تو اب بابل کے آنگن کی چڑیا تھی۔ جو کہیں پڑے ہوئے دانوں کو چنتی ہوئی اڑ جاتی تھی۔ لیکن پالی تو میں تھا اور اُسے یہیں رہنا تھا اسی گھر میں، اسی چھت کے تلے جہاں اسے بہو کو لانا اور لبانا تھا۔ کہیں اور گھر لے لینے سے تو باپ کے گھر کی چھت نہیں بدلتی۔ وہ کہیں چند باتوں کو نہیں سمجھتا، اور با سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیوں اس کے پاس اپنے بہن بھائیوں، اپنے ماں باپ کے لئے چند منٹ بھی نہ تھے امریکن فرم میں اگر کمپنڈ ہو جانے سے کیا وہ کوئی خدا ہو گیا تھا؟ کیوں وہ اس فرم کے ذریعے سے پرائیویٹ کنٹرکٹ لینے اور

یوں پیسہ پیدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا؟ وہ کبھی تو باپ سے بات کرتا جو اس سے پیسے تو نہ مانگتا تھا وہ تو فقط یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس بیٹھے۔ دو تین جسم اکٹھے ہوں جو ایک دوسرے سے نکلے ہیں۔ بدن، صرف بدن کا لمس ہو یہ نہ بھی ہو تو آنکھیں ملیں جو باپ ہی پر نہیں آبا و اجدا پر گئی ہیں پاس بیٹھ کر آج کی نئی تعلیم کی باتیں کرے۔ جس سے پرانے بہت پرے لکھے آدمی بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ ان کی دنیا کا پنا چلے، کچھ اپنی دنیا انہیں دکھائی جاسکے۔ اس سے سیکھیں اور اسے بتا بھی سکیں کہ صرف تعلیم ہی بس نہیں، تجربہ بھی ضروری ہے اور چند حالات میں جیمز بانڈ کے علم سے بہت اوپر ہوتا ہے۔ وہ کبھی کچھ تو مانگے، اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔ کیوں وہ ایک ایک کی اس قدر خود مختار اور بے نیاز ہو گیا تھا؟ یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر اب ماں باپ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بوجھ ہی کی بات ہے تو وہ اب بھی بوجھ ہے۔ کہیں وہ کپڑے اتار کر دھو بن کے سامنے پھینک جاتا ہے اور چونکہ گھر میں کچھ پیسے دنیا ہے اس لئے ماں ماں نہیں رہی۔ سچ مچ کی دھو بن ہو گئی۔ گھر میں بیسیوں جہان آتے جاتے ہیں، انہیں ایئر پورٹ سے لینا یا گاڑی

پر چھوڑنے جانا صرف ماں باپ کا ہی فرض ہے؟ اور کچھ نہیں
 تو لاڈ وہی کولنے، لینے چلا جائے وہ اپنی بیٹی ہے تو اس کی بھی
 بہن ہے اگر پال یہ سب حرکتیں نا سمجھی کے عالم میں کرنا تو کوئی
 بات نہ تھی، لیکن وہ تو بلا کا ذہین تھا اور ایک پل میں معاملے
 کی نہتہ تک پہنچ جاتا تھا۔ چار سال قبل جب ایک نہایت امیر
 ماں باپ کی اکلوتی بیٹی سے اس کا رشتہ ہونے کی بات چلی تو
 کھٹ سے اس نے انکار کر دیا اور بولا ”دس سال مجھے آپ
 کے چکر سے نکلنے میں لگے ہیں، پاپا آپ چاہتے ہیں میں اور سال
 ایک امیر آدمی کی اکلوتی بیٹی کے چکر سے نکلنے میں گزار دوں؟“
 سنت رام اس پتے کی بات کو سن کر چکیت ہو گیا تھا۔ اسے
 اس بات کا گور وہی ہوا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کے ناطے سے
 بہت خود وار واقع ہوا ہے اور افسوس بھی۔ افسوس اس لئے
 کہ باپ کے چکر سے نکلنے کا کیا مطلب؟ کیا بیٹا باپ کے چکر
 سے نکل سکتا ہے یا باپ بیٹے کے چکر سے؟ کیا وہ ایک دوسرے
 سے کبھی الگ نہ ہو سکتے والا حصہ نہیں؟ کیا برا عظمیوں کا فاصلہ
 ہونے پر بھی وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں؟ آخر کون
 سا وہ اندھا ہے جسے وہ ڈور دکھاتی نہیں دیتی جو باپ بیٹے

سے وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے اپنے پیچھے
 چھوڑنا اور چھوڑنا ہی چلا جاتا ہے؟ بیٹیا چاہے باپ کے
 جانے کے بعد یہی کہے کہ میرا باپ نالائق آدمی تھا، مہزاروں
 کا قرض مجھ پر چھوڑ کر چلتا بنا۔ اس پر بھی غلط تو رہنا ہی ہے
 نا؟ نالائق باپ اور لائق بیٹے کا تعلق۔ میں تو مر ہی نہیں سکتا
 جب تک اپنی اولاد کے لئے کچھ چھوڑ کر نہ جاؤں۔ البسا ہوا تو
 ان کی ماں، دھوہن تو مجھے وہاں خدا کے گھر تک نہ چھوڑے
 گی۔ اور وہیں روح تک کا تولیہ سچوڑ ڈالے گی لیکن میرے باپ
 نے میرے لئے کیا چھوڑا تھا؟ اس پر بھی ان کی عزت میرے
 دل میں کبھی کم نہیں ہوتی کیا۔ پیشہ اور جائیداد چھوڑنے ہی
 سے کوئی باپ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے؟ یہ بات تو خدا و
 شمار ہی سے غلط ہے۔ ایک باپ مفروض مرتا ہے۔ جیسی دوسرا
 جائیداد بنا سکتا ہے نا؟ خیر، میرا تو ابھی تعلق روڈ پر ایک منگ
 ہے کیا ہوا گھاٹے کے بعد اس پر تھوڑا پیسہ لے لیا۔ کیا میں اتنا
 ہی گیا کنڑا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا رہن بھی نہ چھڑ سکوں
 پھر گاؤں باجگدل، میں زمین ہے دوسو سیکھے جس میں سے
 کچھ بڑوں کی ہے اور کچھ میں نے اپنے پیسے سے بنائی ہے

کیا یہ میری بہت نہیں کہ اتنی مصیبت آپڑنے پر میں نے اس کا ایک ایسے نہیں بیچا۔ میں نے اس لئے نہیں بیچا کہ میرے پرکھوں کی روح کو تکلیف نہ ہو اور میرے بیٹے مجھے کو سننے نہ دیں۔ پھر بیچ رہے۔ بہت ٹوٹ آئی تو خود کشتی کر کے بیوی کو پیسہ دلوا سکتا ہوں۔

جبھی سنت رام کو اپنا باپ یاد آیا اور اس کی موت کا وقت جس میں صدمے کی انتہا تھی اور اس کے بیچ ایک عجیب سی پراسرار خوشی بھی کہ اب جو بھی اچھا برا کریں گے اپنا کریں گے، اور پال کے سلسلے میں اس بات نے سنت رام کو ایک عجیب طریقے سے مکنت کر دیا۔ آخر کون سا بیٹا ہے جو اپنے دماغ کے کسی کونے میں اپنے باپ کی موت کی خواہش نہ لیے بیٹھا ہو؟

سنت رام کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ ساتھ کے کمرے میں آکر اس نے زبرد پاؤں دالا بمب جلایا اور اس کی مدھم سی روشنی میں لاڈوا، اس کے نیچے باجی اور پھر پال کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ اپنے بیٹے میں جی رہا تھا اور پھر اپنے پوتے، پڑپوتے ہیں۔

جبھی سنت رام کو ایک سنگینٹ کی طلب ہوتی۔

اسے یاد! سگریٹ بھی کیا چیز ہے جس نے بھی اسے ایجاد
 کیا، حد کر دی۔ کیسا ایک ننھا سا رفیق زندگی کا جو آپ کے تنہا
 لمحوں میں کسی دوسرے کے موجود ہونے کا احساس دلانا نہ ہوتا
 ہے اور اس کے دم سے آپ بھی اکیلا محسوس نہیں کرتے، بلکہ
 وہ خود زندگی ہے جس کا ایک کنارہ زندگی ہی کی طرح سے دھیرے
 دھیرے سگتا اور دوسرا موت کے منہ میں یا منہ کی موت میں
 پڑا ہوتا ہے وہ آپ کے ہر سانس کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوا
 خوراکھ ہو جاتا ہے لیکن آپ کے بکھرے ہوئے خیالوں کو ایک
 نقطے پر سمیٹ لاتا ہے۔ آپ چند ایسے لاندہ سمجھ چکے ہوتے ہیں۔
 جن کے بعد اور کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی لوگ کہتے
 ہیں اس سے کینسر ہو جاتا ہے۔ ہوا کرے۔ جو لوگ سگریٹ نہیں
 پیتے وہ کون سی خطر کی جیات جیتے ہیں؟ دینا کے ہر بشر کو آخر
 کوئی نہ کوئی بہانہ تو موت کو دینا ہے۔ سگریٹ کا بہانہ کیوں نہ ہو
 رات جب سنت دام گھر لوٹا تو سگریٹ لانا بھول گیا تھا
 اور اس وقت، ساڑھے چار بجے، دکانیں بند تھیں اور سنت دام
 کی طلب کھلی، جو کھلتی ہی جا رہی تھی ماسٹرنے پیٹے، پال، کے
 سگریٹوں کا پیکٹ پڑا تھا جس کے اوپر مچس رکھی تھی۔ پال

شہزادہ ہونے کے کارن اسٹیٹ ایکسپریس آدھر سگریٹ ہی نہ
 پیتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ، سنت رام کو چار مینار سے لے
 کر قینچی اور گولڈ فلیک تک سب چلتے تھے۔ اسٹیٹ ایکسپریس
 بی لول؟ کیا ضرورت ہے؟ کیا میں چھ، ساڑھے چھ بجے تک انتظار
 نہیں کر سکتا۔ جب کہ پان بیٹری کی دکانیں کھلنے لگتی ہیں؟ لیکن اگر
 انتظار کرنے دے تو پھر وہ سگریٹ نہیں وودھ کا گلاس ہوا
 سنت رام کا ہاتھ پکیٹ کی طرف لپک گیا۔ زیر و پا ور کے بلب
 کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ پکیٹ میں صرف وہی سگریٹ
 تھی۔ ایک تو پال کو ہاتھ روم کے لئے چاہیے ہی تھا اور دوسرا؟
 کیا پتا ایک سگریٹ سے اس کا کام نہ چلتا ہوا اور دوسرے کی
 بھی ضرورت محسوس ہو۔ اس وقت نہیں تو شیو کے بعد سہی یا
 ناشتے کے بعد اس علاقے میں اسٹیٹ ایکسپریس کہاں ملتے
 تھے جو اڑا لینے کے بعد نو دس بجے سے پہلے چوری چپکے رکھ
 دیتے جاتیں، جب کہ پال اٹھتا تھا۔ رکھ بھی کیسے دیتے جاتیں
 کیونکہ ان سگریٹوں کے لئے کنٹ پیس جانا اور آنا پڑتا تھا
 جس کا مطلب تھا آدھا گیلن پٹرول پھونک دینا، ایک سگریٹ
 کے لئے اس سے اچھا ہے کہ چھ، ساڑھے چھ بجے تک انتظار

کہہ لیا جائے۔

لیکن صاحب سگریٹ جب بلاتا ہے تو اتنی زور کی آواز دیتا ہے کہ کانوں کے پرے پھٹ جاتے ہیں وہ آواز نہ پینے والوں کو سنا تی نہیں دیتی۔ ان کے کان سر میں نہیں ہوتے نا۔ کیوں نہ بھیکو، اپنے نوکریا سے سگریٹ لے لیا جائے؟ وہ تو بیٹری پیتا ہے؟ بیٹری ہی سہی۔ لیکن بھیکو کہ اس کی کبھی کرن کی نیند سے جگانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ پورا اپنا ٹکھو و واوہ پھر اس سے ایک کنکری کی فرمائش کرو، کیونکہ بھیکو ہمیشہ بڑا کمر کیا ہوا، کیا ہوا، کہتا ہوا اٹھتا تھا جس سے گھر کے سب لوگ جگ جاتے تھے۔ اس کینے کی نیند بد عنوانیوں کی وجہ سے نہ بکتی تھی۔ اسے باہر چوکیدار بھی تو ہے۔ سنت رام نے دروازہ کھولی کر جھانکا اور بنتیوں کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا، چوکیدار کا کہیں تنم بھی نظر نہ آتا تھا۔ پونے پانچ بجے تھے اور وہ اپنی سمجھ میں پانچ بجاکر اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے کسی چور کے ساتھ جا سوا تھا۔ بیکار ہی ہم لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ کون سا ڈاکہ پڑنے والا تھا۔ سبب کہ سامنے پولیس کی چوکی تھی؟ بھیکو، چوکیدار یا چوکی کے کسی

سنتری سے بٹری مانگنے سے تو یہی اچھا ہے کہ اپنے بیٹے کا اسٹیٹ
ایکسپریس سگریٹ پیا جائے۔ اسے برا تو لگے گا مگر جو ہو گا دیکھا جائے
گا۔

چنانچہ سنت رام نے پکیٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال
کر سلگایا۔ ایک ہی کش سے سنت رام کا اضطراب آوارہ گیا
تھا۔ دوسرے کش سے ایک چوتھائی۔ اس حساب سے تو تیسرے
چوتھے کش سے پوری تسلی ہو جانی چاہیے تھی، لیکن سگریٹ کا
بھی عجیب حساب کتاب ہوتا ہے، جیسے اضطراب کا اپنا لاجب۔
چوتھے کش کے بعد اضطراب کے کم ہونے کی رفتار گھٹ جاتی
ہے اور سگریٹ کے جلنے کی زیادہ۔ بہر حال مزہ بہت آیا اسٹیٹ
ایکسپریس اتنا اسٹرائنگ سگریٹ تو نہیں جتنا چار مینار، مگر
اچھا ہے۔

پورا سگریٹ پی چکنے کے بعد سنت رام کو محسوس ہوا کہ اس
نے بُرا کیا۔ کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک سگریٹ کے بغیر نہ
رہ سکتا تھا؟ نہیں، جوانی میں آدمی اپنے حواس پر قابو رکھ
سکتا ہے، بڑھاپے میں نہیں، آخر بیٹے کا سگریٹ پیا ہے نا!
مجھے خوش ہونا چاہیے اور اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی کیسا

مزہ آیا! چھوٹی چوری میں بہت مزہ آتا ہے۔ جبھی بابی کے بڑھانے کی آواز آتی ”ماروں گا۔ میں تم کو ماروں گا۔“ وہ خواب میں کسی سے لڑ رہا تھا۔ لاڈولنے آدھے سوئے آدھے جاگے عالم میں اسے تھپکنا شروع کر دیا۔ ”سو جا بابی، سو جا۔“ بابی سو گیا اور وہ بھی سو گئی۔ پال کو کچھ تپانہ تھا۔ اس کے خواتے تو جا چکے تھے البتہ ناک میں کوئی چیز اڑے ہوتے کے کارن سیٹی سی بج رہی تھی۔ جبھی اندر سے دھوبن کی آواز آتی:

”سگریٹ پی رہے ہو؟“
 ”ہاں۔“ سنت رام نے وہیں سے کہا۔

جس کے جواب میں وہ بولی: ”صبح صبح ہی شروع ہو جاتے ہو، دن تو چڑھنے دو۔ یوں کلیجہ جلانے سے بیمار ہو گے کہ نہیں ہو گے؟“

سنت رام نے دل ہی دل میں کہا۔ میری بیماری کی جیسے بہت پروا ہے۔ یہ گھر کے لوگ جب پروا کوئی ہوتی ہے تو نہیں کرتے اور جب نہیں کرتی ہوتی تو کہہ نے لگتے ہیں۔ اس نے اندر کے کمرے کی طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا: ”تم سو جاؤ، ابھی سو پاؤ پانچ ہوئے ہیں۔“

دھون کی آواز اس کی انگڑائی میں سے چھن کر آتی: "نہیں مجھے ہٹیر لگانا، چائے گرم کرنا ہے۔ بہت کپڑوں کا ڈھیر ہے۔" جبھی دھون کے اٹھنے کی آواز آتی۔ ہاں صاحب، جب عورتیں اٹھتی ہیں تو وہ اس بات کا رکھ رکھاؤ نہیں کرتیں کہ ان کی کھٹ پٹ سے کوئی ڈسٹرب ہو گا۔ وہ بستر کی چادر کو چھانٹ رہی تھی، جیسے اس پر کہیں ریت آپٹری ہو۔ پھر لماری کی دکیں، سنائی دی اور اس میں سے دودھ کے پیسے نکلے۔ سیسٹل کی کھٹ کھٹ برسوں پہلے لگتی اور دماغ میں فتور پیدا کرتی تھی، اب بول معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔

چادر چھانٹتے ہوئے دھون کی آواز آتی: "اوف، اوف دماغ جل گیا ہے سگریٹ کی بو سے۔"

"اچھا، اچھا،" سنت رام نے کہا، "تمہیں بو ہی آتی رہتی ہے۔"

دھون کو واقعی بہت بو آتی تھی، جو غالباً عمر کا تقاضا تھا۔ چوتھے کمرے میں کوئی سگریٹ پیسے اسے دیں سے پتا چل جاتا تھا۔ ایسے ہی دھسکی، شراب کا، چاہے کسی نے صرف چکھا ہی

ہوا ہوا۔ اس کی کنجوسی، اس کے اخلاقی طور پر اچھا ہونے نے
 گھر کے سب لوگوں کو چور بنا دیا تھا۔ سب بے حالی ہو کر
 غلبتیں کرتے اور پھر انہیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے لیکن
 دھوہن سے کوئی کچھ چھپانہ سکتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ
 نے باہر نکل کر، بالکنی پر جا کر سگریٹ سگایا لیکن جب مڑ کر
 دیکھا تو دھوہن موجود، جس سے سگریٹ کا مزہ ہی جاتا رہا۔
 اس کی اس روک ٹوک نے پال میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر
 دیا تھا۔ اب وہ کھلے بندوں سگریٹ پیتا تھا، بلکہ اس نے
 اسکاچ کی ایک بوتل گھر ہی میں لارکھی تھی۔ باہر سے آنے پر جب
 اسے محسوس ہوتا کہ شراب کم پڑی ہے تو ایک آدھ پیگ گھر
 ہی میں منگا لیتا۔ ماں سے اس کی کئی بار لڑائی ہوتی تھی۔ دھوہن
 آخر اس سے مار گئی تھی۔ اس نے کہا بھی تو اتنا، "میرا کیا ہے،
 جو آئے گی روتے گی نہ،

سگریٹ! دراصل مرد اور عورت کے منہ کی بو کو ایک ہونا
 چاہیے ورنہ سب تباہ ہو جاتا ہے۔ اسی تباہی کے کارن۔
 سنت رام نے اپنی ٹاسپیٹ، ڈوفی، کوپلے سگریٹ پلا لیا تھا۔
 پال اٹھے گا تو کیا کہے گا؟ یوں ایک سگریٹ پی لینے میں تو

کوئی بات نہیں لیکن کسی عمل، کسی ذائقے کا تکمیل نہ پانا برا ہے یہ
 ایسے ہی ہے جیسے دو محبت کرنے والوں میں کوئی تیسرا آجائے
 پھر بال کئی باتوں میں کس قدر کمینہ ہے ایک بار اس کا جوتا پہن
 لیا تو وہ کتنا جزد ہوا تھا۔ اس نے جوتے کو لے کر پھینک ہی
 دیا اور کہنے لگا: "میرے اور پیار کے پیر ایک ہیں کیا؟ اب
 یہ کھل گیا ہے اور میرے کام کا نہیں،" سنت رام کو بہت
 دکھ ہوا ایک بار بیٹے کا جوتا پہن لیا تو کیا ہو گیا؟ میسوں بار
 اس نے میرا چل پہنا ہے، میں نے تو کچھ نہیں کہا، الٹی مجھے
 خوشی ہوتی اس احساس کے ساتھ میرے بیٹے نے میرا جوتا پہنا
 ہے، ادھر بڑوں کا یہ کہنا بھی دماغ میں آیا جب باپ کا جوتا
 بیٹے کے برابر آجائے تو پھر اسے کچھ نہیں کہتے چنانچہ جب
 سے میں نے سب کہنا سنا چھوڑ دیا۔ نہیں، ایک بار اس نے
 کسی سمگلر سے امریکن جو کن خریدی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی
 پال کو بھی اچھی لگی تھی جبھی تو اس نے خریدی، لیکن میں ہمیشہ کی
 طرح اپنے بڑھاپے کے کارن اسے پہننے کے جذبے کو روک
 نہ سکا، چنانچہ میں نے پہن لی۔ اس کے رنگ بڑے شوخ رنگ
 تھے اور مجھے اسے پہننے میں بہت مزہ آیا، لیکن پہلے تو دھوپ

نے میرے مزے کو کر کر لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دی۔
 ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ اندر ہی اندر اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولی: ”کچھ نہیں“
 اور پھر وہ بھی نہ سکی اور کہنے لگی: ”کیسے گھوم رہے ہو، جیسے
 ویسی مرغامرغی کے ارد گرد گھومتا ہے۔“
 یہ جذبات کا دھوبلی پٹیرا تھا، خیر۔

لیکن رہی سہی کسر پال نے پوری کر دی۔ میں نے اپنا شوق
 پورا کرنے کے بعد اس جرکن کو بڑی احتیاط سے وارڈ روم
 میں ٹانگ دیا، لیکن صبح ہی تو پال جرکن کو میرے پاس لے آیا
 اور بولا: ”پاپا، آپ ہی اسے پہن لیجئے۔“
 میں نے جھرمٹا مذاق سے کہا: ”کیوں، تم کیوں نہیں پہنتے؟“
 ”یہ میرے کام کا نہیں رہا،“ وہ بولا، ”دیکھتے نہیں آپ
 کا پیٹ بڑا ہے، اس کے پہننے سے لاسٹک چلا گیا ہے اس
 کا۔“

مجھے بے حد غصہ آیا اور میں اس پر برس پڑا۔ میں نے کہا: ”
 میں تمہارا باپ ہوں، جرکن پہن لی اور تمہارا نقصان کر دیا؟“
 ”تم نے سینکڑوں نہیں ہزاروں بار میرا نقصان کیا ہے، میں نے

کبھی نہیں کچھ نہیں کہا ہے، اُلٹا خوش ہوا ہوں۔ چلیو یوں کہہ لو کہ
 باہر سے ناراضی کا ثبوت دیا لیکن اندر سے میں کتنا خوش تھا۔
 تم سینکڑوں بار میری قمیض، میرا جوتا پہن گئے ہو، میں نے
 یہی کہا ہے میرا بیٹا میرے کپڑے پہنتا ہے، اور تم نے اسی طرح
 اس دن دو گھوڑے والی بوسکی کی قمیض میرے منہ پر پڑے
 ماری۔ تم نہایت کہینے، نہایت بے شرم آدمی ہو۔“

بجائے اس کے کہ پالی کو افسوس ہو، وہ میرے ساتھ دلیل
 بازی پر اُتر آیا: ”آپ پان کھاتے ہیں۔“ وہ کہنے لگا، ”اور
 اس کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اس پر پڑ جاتا ہے۔ کیا وہ قمیض میرے
 پہننے کے لائق رہتی ہے؟“

ان دنوں بھی لاڈو یہاں، اپنے مایکے، آئی ہوئی تھی۔ اس
 جھگڑے میں وہ بھی پاس آکھڑی ہوئی اور بول اُٹھی: ”پپا
 بالکل میری طرح ہیں۔“

چھوٹے دنوں بھی، جو اس وقت اپنے ماسوں کے ہاں گڑ
 گالوں گئے ہوئے ہیں، یہیں تھے، چٹکی بھیکو کی مدد سے لبشر کی
 سلوٹس نکالتی ہوئی بولی وہاں، بات کرتے ہیں تو لاڈو دیدی
 کی طرح منہ کی ماری پھوڑا سامنے دالے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

تماشا اس وقت ہوتا ہے جب کہیں پیا اور لاڈ و آپس میں بات کر رہے ہوں تو۔“

لاڈوسن رہی تھی، دوسرے سب سن رہے تھے نہ چاہنے کے باوجود میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ چلی آتی تھی۔ بات سنجیدہ بھی تھی اور مضحک بھی۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا بھی تو اتنا: ”ماں آخر لاڈ کا باپ ہوں نا، اسی پر گیا ہوں۔“

اور تو اور چھوٹا، سن، بھی تنہا رہا تھا۔ سنجیلوں کی طرح پیٹھ پر پیدائشی طور پر کمزور ہونے کے کارن وہ کبھی کھل کے نہ ہنسا۔ ”ہی ہی، پان کھاتے ہیں نا پیا!، اس نے کہا۔“ تو قمیض پر سامنے تو لگتا ہے، لیکن پیٹھ پر جانے کیسے لگتا ہے؟ یہ سب سمجھتے تھے۔ میں پان منہ سے تو کھاتا ہی نہیں، قمیض سے کھاتا ہوں۔ اس پر طرہ، دھو بن منظر پر چلی آتی۔ میرا خیال تھا کہ ماں ہونے کے ناطے وہ باپ کا پکش لے گی، لیکن صاحب اس نے اٹا بیٹے بیٹیوں کی تابعدار شروع کر دی:

”کیا پوچھتے ہو ان کا؟“ وہ بولی، ”بالکل باقی ہیں اوپر۔“ کھانا کھائیں گے تو سالن کمرے پر گرا ہوگا، لکھنے بیٹھیں گے۔ سیاسی میں ان کا کمرہ کیا؟ پتا تو مجھے چلتا ہے۔ دھو تے دھو۔“

جس کے ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ یہ میری قسمت! عمر گزر گئی میری
ان کے داغ نکالتے نکالتے۔

صرف ایک باقی رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا
بالس تھا جس سے وہ ”بڈھا بابا“ کو جھنکارا کرتا تھا۔ ”ماروں
گا۔“ وہ خلا میں خیالی دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا بڈھا بابا اس کا خیالی
دشمن میں ہوں۔ پھر جی کے جھونکنے کی آواز آتی، جیسے آپ لٹاؤ
کہہ لیجئے۔ جیسے بھلی کابل چکانے چلا گیا تھا۔ ورنہ وہ اپنی مکھی
بولی میں کہتا: ”ہم میاں پوری کا جھگڑا میں نہیں پرہیز“ اودیہ
بات اور بھی میرے خلاف جاتی۔ گھر بھر میرا دشمن ہو گیا تھا ایسا
پہلے تو نہ تھا۔ چند برس پہلے جب سے مجھے کاروبار میں گھساٹا پڑا
ہے دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کسی کو میری بات ہی پسند نہیں یا شاید
میں بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے سب کو برا لگتا ہوں۔ مجھے ان
کے سامنے سے ٹل جانا چاہیے، اس دنیا سے ٹل جانا چاہیے۔ لیکن
میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ میں نے اس گھر، ان لوگوں پر اپنی
جان بھی داری۔ نہ کسی کلب کا ممبر ہوا، نہ ریس کو درس پر گیا۔ یہ
تو یہ کوئی پیکر بھی ٹوہب سے نہ دیکھی۔ کام، کام اور کام۔ تفریح

کے لئے ایک لمحہ نہیں، اسی لئے میں ذہنی طور پر بیمار ہو گیا ہوں
 شاید پاگل۔ پاگل نہیں تو سنسکی ضرور ہوں۔ کبھی پاگل یا سنسکی کو پتا
 چلا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اسے تو صرف دوسرے جانتے ہیں۔ کبھی
 کبھی ان کی شکلوں سے اپنی شکل کا پتا چلتا ہے۔ نہیں یہ بات
 نہیں۔ خدا! کسی کو خسارہ نہ ہو۔ جوانی میں جو ہونا ہے وہ ہو جائے
 لیکن اس ڈھلتی، آخری عمر میں نہیں، جب کہ مدافعت کی ساری
 قوتیں ختم ہو جاتی ہیں، بچوں کا فادر ایسے گڑبڑ ہو جاتا ہے اور
 بڑی کا بھی۔

پال آٹھ بجے اٹھ گیا تھا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر سنت رام سننا
 گیا۔ ڈرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آدمی سامنے یا دل میں کہنے لگے
 ”میں کسی سے ڈرتا ہوں؟“ سنت رام پر اچھی طرح سے واضح
 ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ڈرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا معاملے
 کو اس سطح پر لے آئے جس سے بیٹا یہ کہے کہ میں اس گھر میں
 نہیں رہوں گا۔ پال تو چاہتا تھا ایسا موقع پیدا ہو۔ کوئی سنے
 تو سنسے، بیٹے کا ایک — صرف ایک سگریٹ پی لینے سے اتنا
 ڈر اور اپنی ذہنی یکہک۔

چائے سے پہلے پال نے باپ کی طرف دیکھا اور معمول کی

نفسکار کی جس کے جواب میں سنت رام نے سر ہلا دیا اور اپنی نگاہیں
 پیچی کر لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پال دوسری طرف دیکھے تو وہ اس
 کی طرف تکتے، لیکن پال نے برابر اپنا منہ باپ کی طرف رکھا۔
 جس سے گہرا کر سنت رام نے اپنا چہرہ ہندوستان ٹائمز
 کے پیچھے چھپا لیا۔ پھر اسے تھوڑا اٹٹھا کر دیکھا تو پال شرک
 شرک چاتے پی رہا تھا جس کے بعد اس نے کھٹ سے پیال
 پرچ میں رکھی، پھر وہ سگریٹ کا پیکٹ تھامے ہاتھ روم کی
 طرف نکل گیا۔

اب تک تو سب ٹھیک تھا۔ پال نے پیکٹ کھول کر نہیں
 دیکھا تھا نا۔ جب وہ ہاتھ روم جاتے گا تب اسے پتا چلے گا اور
 سنت رام بیٹے کے باہر آنے اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے
 دھنی ادھر ادھر ہوتا رہا۔ دھوین نے کہا: ”نہاؤ گے نہیں۔“
 جواب میں جھلاتے ہوئے سنت رام نے جواب دیا: ”نہیں
 ملے کی پڑی ہے، اب ایک ہی بار نہاؤں گا۔“

دھوین جیرانی سے سنت رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی
 ہر پھینکار کو معمول کی لالہ یعنی سمجھ کر ناشتے کے دھندے میں
 شغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں پال ہاتھ روم سے آیا تو اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، ماتھا کچھ اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ واش بین میں جلدی جلدی اپنے ہاتھ صابن سے دھو رہا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی؟ کیوں وہ جلدی جھاگ جانا چاہتا تھا؟ سامنے اس سے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھا، منہ سے جھاگ چھٹ رہے تھے۔ نہیں، ہاتھ دھوئے ہوتے جھاگ اُڑ کر چہرے پر چلے آئے تھے۔ چونکہ ہاتھ ابھی صابن سے اٹکے تھے اس لئے اس نے کڑتے کے بازو سے جھاگ پونچھ دیا اور اپنا چہرہ دیکھنے لگا اس کے ہاتھ پھول رہے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر ہنسنے پھیلانا تو سمجھ

تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں۔ ہاتھ دھوئے ہوئے پال ٹوٹا تو دھوہن نے آواز دی: ”راست تم پھر پی کر آئے تھے؟“
پال نے کوئی جواب نہ دیا، صرف اتنا کہا: ”دھوہن، آج پھر پیئے والا ہوں۔“

دھوہن تن گئی۔ وہ ایسی دہنے والی تھوڑی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا: ”آج پی کر آئے تو میں دروازے میں قدم نہ رکھنے دوں گی۔“ جس کے جواب میں پال نے کہا: ”آنا کون

چاہتا ہے اس جیل خانے میں؟ میں نے پہلے ہی گولف لنکس میں ایک کمرہ دیکھ رکھا ہے، پھر دھوہن کی پائتیدار آواز آئی پٹنکل جاؤ، ابھی نکل جاؤ، جس سے سنت رام کی جان نکل گئی۔
 ”شانتی! سنت رام نے کٹرک کر کہا ”کیا بکیتی ہو؟ یہ گھر تمہارا ہے؟“

اسی پنجم میں دھوہن نے جواب دیا: ”ہاں، میرا ہے۔ جانا ہے تو جانے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ سبھلا ہو تم باپ بیٹوں کا جنھوں نے جینا سکھا دیا۔“ اور پھر وہ رونے لگی۔ سنت رام اس بات سے تو ڈرنا آیا تھا کہ ایسا موقع نہ آئے۔ بیٹے کی بد عنوانیوں کو دیکھ دیکھ کر اندر سے کڑھنا رہتا تھا۔ لیکن باہر سے کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ بد چلے جاؤ، مگر پھر واپس آجاؤ، کہنا مشکل۔ پال کے باقی کے کام کی زخاہ اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی بیٹو بنا رہا تھا اور اپنی ٹھوڈی پر بے شمار قسط لگا رہا تھا اور خون پو پنچہ رہا تھا۔ اس نے ماں کو ایسا جواب کیوں دیا؟ وہ ماں کو الٹی سیدھی کہتا تو سنت رام کو تکلیف ہوتی تھی اور ماں اُسے کچھ کہتی تو اذیت۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ زیاوہ قدرتی تھا۔ جس میں وہ ایک دوسرے کو سن سنا کر پھر

ایک ہو جاتے تھے۔ مگر آج پال کا انداز یہی تھا کہ وہ جاتے گا تو پھر نہیں آئے گا۔

”آنا کون چاہتا ہے اس جیل خانے میں؟“ اس کا کیا مطلب پال کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اندر سے محسوس کر رہا تھا کہ اس گھر میں آنے کا کیا فائدہ جہاں کوئی چیز اپنی نہ رہ سکے جو ناچر کن اور نہ سگرٹ۔ پھر پال جلدی جلدی نہایا اور کپڑے پہنتے ہوئے باپ کے پاس سے گزر گیا سنت رام نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن اس نے آنا کافی کر دی۔ اخبار بھی اٹھا کر نہ دیکھا اس نے ادرا سیٹ ایکسپریس کا پکیٹ پوری نفرت سے کھڑکی کے باہر پھینکتا ہوا وہ نکلنے لگا۔ دھوبن تو اس سے لڑ بیٹھی تھی اس لئے اس نے بیٹے کو ناشتے کے لئے بھی نہ پوچھا سنت رام نے اسے رد کرنے کی کوشش کی اور آواز دی ”بیٹا، ناشتہ تو کر لو۔۔۔“

”نہیں۔۔۔“ پال نے مصمم جواب دیا اور باہر نکل گیا جس انداز سے اس نے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا تھا اس سے روح تک میں تشنچ پیدا ہو گیا۔

پال کے جاتے ہی دھوبن اور سنت رام میں ٹھن گئی۔ وہ

تو اسے صرف اسی قضیت کے سلسلے میں مطلع کر دیا تھا۔ لیکن دھوڑ
 ایک طرف روئے جا رہی تھی اور دوسری طرف کوسنے سے
 رہی تھی۔ اس سلسلے میں وہ نئے پرانے سب دفتر کھول بیٹھی۔
 اس کی باتوں سے تو ایسا پتا چلتا تھا کہ اس گھر میں آگہ اس نے
 کبھی کوئی سکھ نہیں دیکھا۔ وہ بہت پھوٹی قیمت والی تھی۔
 حالانکہ سنت رام سمجھتا تھا کہ اس دنیا کا کوئی سکھ نہیں جو اس
 نے بیوی کو نہ دیا ہو اور آگہ دکھ بھی دیکھا ہے تو ساتھ اس نے
 بھی تو دیکھا ہے۔ لیکن بیوی نہ صرف اپنے بلکہ پوری اولاد کو
 تباہ و برباد کرنے کا ذمہ دار سنت رام کو ٹھہرا رہی تھی وہ
 کہہ رہی تھی۔ ”پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے
 لڑتے جھگڑتے رہے میرے ساتھ پھر دوست تجھ پر لا دیتے۔
 ایک ماٹھ سے بچہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے
 روٹیاں پکا رہی ہوں ان بڑکٹوں کے لئے۔ اب قصائی اولاد
 کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی۔ پیسے کپڑے کی جس
 سے وہ نالائق نکل آئے سب کے سب ادراپ بیٹے کی یتیمت
 کہ وہ تمہارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے؟“
 سنت رام حملے کی بجائے مدافعت پر اتر آیا تھا واقعی وہ

کیا تھا۔ جو بیوی کو بچوں سے نہ بچا سکتا تھا اور نہ بچوں کو بیوی
 سے۔ جب تک لاڈ و بھیجک گئی اور آنکھیں پونہچتے ہوئے
 منظر کو دیکھنے لگی۔ کاش وہ تھوڑی دیر پہلے اٹھ جاتی اور اپنے
 بھائی کو جانے سے روک لیتی۔ وہ میرا بیٹا ہے اس کا بھی تو
 بھائی ہے لیکن ماں کو روٹنے دیکھ کر وہ اس کی طرف ہر
 گئی۔ بظاہر اس نے ماں ہی کو چپ کرنے کے لئے کہا اور
 سنت رام کو صرف دیکھا، لیکن اس کے دیکھنے ہی میں کیا
 کچھ نہ تھا۔ جس سے سنت رام کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے
 اور اس کے بعد وہ بچے کو سنبھالنے لگی اور گھر میں اپنے مہال
 کو ٹیلی فون کرنے لگی تاکہ وہ آئے اور اسے لے جائے۔ اس
 کے بعد ایک خاموشی سی چھا گئی۔ جس میں دھوبن کے سکینے کی
 آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ خاموشی لاڈ و اور دوسرے بچوں
 نے بھی تو یہ سمجھ لیا تھا کہ روز کا معاملہ ہے، کون اس پر سڑھنے؟
 یہ کیا میرا ہی معاملہ تھا؟ سنت رام نے سوچا۔ گھر کے کسی اور
 بشر کا نہیں؟ پال تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ ماں کے بات
 کرنے سے پہلے دھوبن کی بات تو صرف ایک بہانہ ہو گئی۔
 وہ نہ چاہتا تھا پال کو کوئی بہانہ بھی نہ دے، لیکن اس نے

نہیں تو اس کی ماں نے اسے دے دیا۔ کیونکہ وہ جل بھن گیا تھا۔
 پکیٹ میں صرف ایک ہی سگریٹ پاکرہ...
 سنت رام دفتر میں داخل ہوا تو اس نے کسی کو علیک بلیک
 کا جواب نہ دیا۔ لیکن ان لوگوں کو کیا پرہ دانتھی؟ آج صاحب کا موڈ
 اچھا نہیں۔ کسی نے کہا۔ پھر دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”اچھا
 کب ہوتا ہے؟“

کبہن میں داخل ہوتے ہی چیر اسی چندو سے سنت رام نے
 سگریٹ کا پکیٹ منگوایا۔ چندو ہمیشہ پہلے ہی سگریٹ خرید کر رکھتا
 تھا۔ وہ اپنی جیب سے دام خرچ کر دیتا اور جب مالک سے مل
 جاتے تو جیب میں ڈال لیتا۔ سنت رام نے اپنا کوٹ ٹانگا پکیٹ
 پر سے کاغذ چھاڑا، سگریٹ نکالا اور سلگایا اور کام کرنے بیٹھ گیا۔
 لیکن آج سنت رام کا جی کام میں نہ تھا، ایک شدید ڈرنے اس
 کے جسم ذہن کو ماف کر دیا تھا۔ اس نے گھومنے وال کدسی پر
 پیچھے پٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں مینر پر رکھیں اور سگریٹ کے دوچارہ
 سجے سجے کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ میں نے کسے تباہ کو دیا ہے
 گھر کے لوگوں کو؟ بیوی اور بچوں کو؟ میں معر حونے کے باوجود
 پٹھے دھنے کی وجہ سے آج کل کے زمانے کا ہوں۔ میں نے شوہر

اور باپ بننے کی بجائے ان سے دوستی رکھنے کی کوشش کی شاید
 یہی تصور تو نہیں میرا؟ میں نے بڑی سے ایسی باتیں کہیں جو پرانے
 خیال کے باپ نہیں کرتے۔ جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے
 کہا تھا وہاں مخلوط تعلیم ہے لاڈو، وہاں لڑکیاں ہوں گی اور
 لڑکے بھی، اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل
 ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آگئی ہے۔ جسے گڈ ٹائم کہتے
 ہیں۔ گڈ ٹائم گڈ ٹائم ہے، لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق
 ہے۔ اسے غم مت بھولنا۔ مرد پر کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ
 وہ اپنے اخلاق، اپنی تہذیب سے اسے قبول نہ کرے، لیکن
 عورت پر بہت ہے، کیوں کہ بچہ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی لئے دینا
 بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضا
 کیا جاتا ہے۔ قدامت پرستی کا، اور یہ ٹھیک ہے۔ انہیں کبھی اپنے
 آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہیے جو اس کی اور اس
 کے بچوں کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

دھوئیں کے مرغولے میں سنت رام کو اس وقت کا بیٹی کا
 چہرہ یاد آیا۔ وہ بڑبڑ باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ ہی
 تھی اور کچھ نہیں سمجھتی۔ شاید وہ سوچتی تھی پاپا یہ آج کیا لے بیٹھے

ہیں؛ اس بات کو تو آج کل کے زمانے کی ہر عورت، ہر لڑکی سمجھتی ہے۔ پیا کتنے پرانے خیالات کے ہیں؛ اگر میں پرانے خیالات کا ہوں تو روز یہ قصے کیا سنتا ہوں؛ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو بدھ کے زمانے میں بھی کہی جانی چاہیے تھی اور آج کے زمانے میں بھی۔ کیا انسان مشق اور غلطی ہی سے سیکھتا ہے؛ لیکن اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ جہاں اس محلے کے دوسرے بچوں نے بد عنوانیاں کیں وہاں میرے بچوں نے نہیں۔ کم از کم لڑکیوں نے نہیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جو میں نے انہیں دی تو پھر یہ تباہی کیسی؛ پال چھبیس برس کا ہو گیا تھا جب میں نے براہ راست اس سے پوچھا کہ اسے عورت کے سلسلے میں کوئی تجربہ ہوا ہے؛ کیوں کہ وہ بیٹا ہونے کے علاوہ میرا دوست تھا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔ اب مجھے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ تجربہ کار کامیاب ہوا یا نہیں کیوں کہ جنسی فعل ایک بہت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ اس میں کوئی سی بھی غلطی پوری زندگی پر چھا سکتی ہے۔ اسی لئے تو مرد و عورت کے بیچ محبت اور شادی کی چار دیواری کا تحفظ لازمی ہے لیکن پال بھی میری طرف بڑبڑا دیکھ رہا تھا اور شاید جی ہی جی میں ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

ہو نہر! فمے داری! پیا انیسویں صدی میں سائنس لے رہے
 ہیں لیکن یہ طے تھا کہ بہت سی باتیں وہ نہ جانتا تھا اور میں نے
 اس کے دماغی جائے اور پھپھوندیاں اُتارے اور اسے اس
 قابل بنایا کہ وہ دنیا اور اس کے حالات کا مقابلہ کر سکے اور آج
 اُسی بیٹے نے اس کا ایک سگریٹ پی جانے سے منہ موڑ لیا
 مجھ سے!

نہیں، ہو سکتا ہے معمول کی طرح وہ کسی اپنی ہی دھن
 میں ہو اور جلدی گھر سے باہر نکل گیا ہو۔ فرق یہی ہے ناکہ
 پہلے وہ اس کے قریب جاتا اور آج ساڑھے نو بجے نکل گیا تھا۔ کل
 میری ایک فرم سے لاکھ روپے کی ٹویل ہونے والی ہے۔ سب
 ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر پال خفا بھی ہو گیا ہے تو راضی ہو جائے گا۔
 پھر سب مل کر کلر کے پہاڑ پہ جائے گا پروگرام بنائیں گے۔
 لیکن، ایک سگریٹ... صرف ایک سگریٹ...

سنت رام کا خون بار بار کھول اٹھتا تھا، جیسے اس نے
 بیٹے کو معاف نہ کیا ہو، خود کو معاف نہ کیا ہو۔ مگر جو باپ بیٹے
 سے نفرت کرتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے، جو بیٹا باپ
 سے نفرت کرتا ہے اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ پال دراصل

باپ سے نفرت نہیں کرتا تھا خود سے نفرت کرتا تھا کیوں کہ مقابلے کی اس دنیا میں جب تک وہ باپ سے آگے نہیں نکل جلتے گا خود کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ باپ سے محبت اس وقت کر سکے گا جب اسے نالائق اور بے وقوف ثابت کر دے۔ سنت رام نے گھنٹی پر ماتھ مارا اور چندرپوسے کہا ڈولی کو بلاؤ۔

ڈولی اندر آئی۔ آج اس نے بابوں کے پرہیزگار کھے تھے اور چست بلا ڈز کے ساتھ ایک سفید رنگ کی ساری پہن رکھی تھی کیوں کہ سنت رام کو سفید رنگ بدست پسند تھا لیکن سنت رام نے ڈھب سے اس کی طرف نہ دیکھا ڈولی جانتی تھی۔ آج کل بوس کٹا سا رہتا ہے۔ اس نے بھی دلوں سے بزنس کا انداز اختیار کر رکھا تھا یہ تو اس کا کہیم تھا کہ ایک بڈھے آدمی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ کام کرتی تھی تو پیسے لیتی تھی بیچ میں وافر باتیں کیسی؟

اندر آنے کے بعد جب ڈولی نے "یس سر" کہا تو سنت رام نے چھیچھلتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور اپنے آپ کو کہنے سے روک لیا کہ تم بہت خوبصورت لگتی ہو ڈولی!

لیکن ایک لمحے کے لئے اس کا دل، جو کہیں بھی چھٹکارا پانے کے لئے تڑپ رہا تھا، ڈولی کے خوبصورت بالوں میں اٹک گیا۔ یہ عورتیں بھی خوب ہیں۔ اگر مرد کا دل سیدھے بہاؤ میں نہ بیٹے تو اسے سروں اور اس کے ہچکولوں میں ڈبو دو۔ مگر سنت رام نے جلد ہی اپنی آنکھیں اس طوفانی بہاؤ سے اور پیچھے کے مہنور سے ہٹالیں اور دائیں طرف دو اکٹھا سو کے کیلنڈر دیکھنے لگا۔ جیسے اسے کوئی تاریخ دیکھنا ہو۔ ایسی حرکتوں کو عورت خوب سمجھتی ہے اور اپنی نظریں اپنے شکار پر گاڑے رہتی ہے۔ مرد جانتا ہے کہ اس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تو گیا، اس لئے وہ پرے، اور پرے سے پرے، دیکھنے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کب تک؟ آخر منٹ کے سوویں حصے کے لئے وہ مجبوری اور بے اختیاری کے عالم میں پھر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی آخری پھر پھر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سنت رام نے ڈولی سے پوچھا: ”پرکتنز کہاں ہے آج کل؟“
 پرکتنز ڈولی کا بھائی تھا۔ جاہن پرکتنز۔
 ”ہیں ہے۔“ ڈولی نے جواب دیا اور تھوڑا مسکراتے کی

گوشش کی۔ وہ سنت رام کے اس سوال کو ادھر ادھر کی باتوں میں سے سمجھتی تھی جو مطلب پہ آنے سے پہلے مرد ہمیشہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تو سخت بزنس کا محلِ ردار کھنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی مذاق ہے؟ جب چاہے بلالو، جب چاہے جھٹک دو۔ اتنے دنوں تک بات ہی نہیں کی، دیکھا تک نہیں اور گزر گئے اور آج ایک ایچی پر کنز یاد آیا ہے!

لیکن ڈولی بھی کب تک بزنس کا انداز رکھ سکتی ہے؟ سنت رام نے ڈولی کو نادانی کے عالم میں سگریٹ پیش کر دیا، ایک ہر سی ڈولی کے بدن میں دوڑ گئی جو اس کے بالوں کے پر مے زیادہ مضطرب تھی۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک دیئے اور بولی: ”تو، تھینکس“ اور پھر غصے اور شکایت سے اس کی چھاتیوں اُپر نیچے ہونے لگیں۔ سنت رام نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں گاڑتے ہوئے ایک روئے انداز میں کہا: ”ڈول...“

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سنت رام کہنے جا رہا ہو: دنیا نے میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ گھر کے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک غم نہیں جو ایک معمولی سے ”ورینڈ“ کے لئے مجھے التفات کا

دھوکا دے سکتی تھیں اور تم نے دھوکا دیا اور وہ مجھے لمبی
 محبت لگی جو سچی محبت سے کہیں اُدھر ہوتی ہے۔ اس میں وہی
 فرق تھا جو اصلی بوسے اور چوری کے بوسے میں ہوتا ہے جس
 میں پچھلا لاکھ روپے کا گھانا اور آنے والا لاکھ روپے کا نفع
 بڑے خوبصورت طریقے سے ایک دوسرے میں حل ہو جاتے
 ہیں۔ ڈوولی نے سنت رام کی طرف دیکھا، وہ نہ وہ اور بھی بڑھا
 جو جاتا اور اسے ایک کی جگہ کئی اور گھاٹے پڑ جاتے جن سے
 وہ خود بھی بے کار ہو جاتی۔ اس نے اپنے رحم کی تنہوں سے
 سوچا جو اس کی ماں تھی، اور دنیا بھر کے مردوں کی ماں، چاہے
 وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ پھر آل راٹ کہتے ہوئے اس نے اپنا
 ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھایا۔ سنت رام نے لاٹھری جلا کر ڈوولی
 کا سگریٹ سنگایا۔ ڈوولی نے کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے
 ایسے ہی سگریٹ کی طرف دیکھا۔ پھر دوسرا کش لگانے کے بعد
 وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھی، پیچھے کبین کے دروازے کی طرف
 دیکھتی ہوئی سنت رام کی طرف بڑھی۔

جیسی سنت رام نے کہا: ”یوکنز شہر میں ہے تو اسے کہو۔“
 ڈوولی وہیں رک گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی تاکہ وہ اپنا

فقیر نکل کر لے بسنت رام نے کہا: مجھے اسٹیٹ ایکسپریس کا ایک
کارڈن لادے، پیسے پھر دے دوں گا۔
”آل رائٹ“ ڈولی نے کہا اور پیچھے ہٹتی ہوئی وہ کیبن سے
باہر نکل گئی۔

سنت رام گھر پہنچا تو کارڈن کی قلعہ بندی کے باوجود وہ ڈر رہا
تھا۔ ایک نہیں بیسیوں واسے دامن گیر تھے اس کے جن کے بارے
میں وہ دھو بن یا لاڈوسے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کے
تھوڑی دیر بعد ہی پال چلا آیا بسنت رام کے جسم میں جو ٹپکپی
پیدا ہو رہی تھی بند ہو گئی، بلکہ ایک عجیب طرح کے سکون، نرمی
اور گرمی کا احساس ہوا اسے، جیسے سردیوں میں کمرے کے اندر
بخاری جلا دے لیکن پھر وہی ڈر اس کے جسم و ذہن کا احاطہ
رہنے لگا۔ کہیں اپنے کپڑے لئے اٹھانے اور گولف لنکس کے
مرے میں منتقل ہو جانے کے لئے تو نہیں آیا، پال؟ مگر اس
نٹ کے نوکر کی آثار نظر نہ آتے تھے پھر وہ آج جلدی کیوں
بلا آیا تھا؟ وہ تو کبھی نہ لوٹا تھا رات کے ایک دو بجے سے
بلے!

کیا وہ اچھا بیٹا، راجا بیٹا ہو گیا تھا؟ لیکن اچھا بیٹا ہونے

کے باوجود وہ چپ کیوں تھا؟ وہ لاڈلوں کے ساتھ بات کر سکتا تھا، اور نہیں تو بابی کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ کمینہ! کس قدر بغض سے بھرا ہوا تھا اس کا سینہ۔ لیکن پال نے کوئی کپڑے اوڑھنے نہ کئے۔ وہ ایک منٹ کے لئے اپنے کمرے کی طرف گیا اور پھر باہر آتے ہوئے باپ کی طرف گیا اور میب سے ایک پیکٹ نکال کر بپا کو پیش کر دیا۔ سنت رام نے دیکھ کر اور پوچھا: ”یہ کیا؟“

”ریشم سو برائین۔“

ریشم سو برائین سگریٹ — اور پورا پیکٹ باخون سنت رام کے کانوں اور آنکھوں تک آنے لگا۔ یہ ایک سگریٹ تو کیا؟ لیا ہے اس کا، اس کے عوض پورا پیکٹ لائے دے رہا ہے۔ ہوتا مادہ ہے ایک طریقے سے۔ سنت رام نے پیکٹ اٹھا اور پورے زور سے پال کے منہ پر کھینچ مارا۔

”دلچے، شہرے، حوا جی۔“ سنت رام کہہ رہا تھا، ”تو کہ سمجھتا ہے میں اپنے سگریٹ بھی نہیں خرید سکتا؟ تجھے خریدنا نہیں دے سکتا؟ اتنا تو نہیں مرا ہوں۔ جتنا تو سمجھتا ہے! تو تیرے ایسے سو کمینوں کو خرید کے رکھ لوں اور جیب یہ

ڈال کے چل دوں، ہاسٹرڈ!،

پال کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ پوٹ
پر رکھ لیا جس پر پیکٹ کے لگنے سے ایک کٹ سا چلا آیا تھا
اور خون کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کہا
بھی تو صرف اتنا، ”پپا!“

لاڈ ویڈرم سے ددڑی ہوتی آتی اور اس نے بھی اتنا
سا کہا، ”پپا!“ پھر دھوبن لڑتی ہوئی بولی، ”کیا ہوا جی؟“
”کچھ نہیں،“ سنت رام نے سب کو پیچھے دھکیلتے ہوئے
کہا، ”مجھے اس پلے سے اپنا حساب برابر کر لینے دو۔ بہت
دیر ہو گئی اے ٹھکے ہوئے،“ پھر اپنے بیٹے کے چہرے پر خون
کا قطرہ دیکھ کر سنت رام اور ڈوہ گیا، اور بھی دشتناک ہو گیا کیونکہ
بیٹے کا خون دیکھنا کوئی آسان بات نہیں دیکھنے والے کو بظاہر
وہ بیٹے کا خون معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خون اس کا ہوتا ہے جس
کا وہ خون ہے۔ اور بھی آگے لپکتے ہوئے، منہ پر کھٹ لاتے
ہوئے سنت رام کہہ رہا تھا، ”میں تجھے جان سے مار دوں
گا آج۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے۔ یہ بھی ایک مثال ہو جانے
دو۔ بیٹے باپ کا خون کرتے آتے ہیں، آج باپ کو بیٹے کا خون

کرنے دیے۔ مادر..... میں نے سمجھے کیا نہیں دیا؟ تو باہر پنجاب
 پڑھنے کے لئے گیا تو چار سو روپیہ مہینہ بھیجتا رہا۔ پھر نو دہائیوں
 سے بھاگ آیا اور میرے دوست نے دوسرے سمجھے اپنے ماں
 رکھا در نہ سمجھے کون پوچھتا ہے۔ چیتھڑے کو؟ اور پھر بھی پیسے
 بھیجتا رہا، میرے بیٹے کو تکلیف نہ ہوا، اور تو اس سے ہوشیاریوں
 اور ریسٹورانوں میں جاتا ہر جو قسم کی بددعا شایاں کرتا رہا۔ تیرے
 اپنے بکنے کے مطابق تیرے دوست سمجھے شہزاد دکتے تھے۔
 کیوں کہ تو باپ کے مال پر عیش کرتا تھا۔ پھر تو نے بی۔ اے میں
 کمپارٹمنٹ ل اور امتحان کو پورا نہ کیا کیونکہ تو ہندی میں فیل
 ہو گیا تھا۔ ہندی بھی کوئی بات تھی سبلا؟ میں نے کتنی سمجھ سے
 منبش کیں کہ ایک مضمون ہے، پاس کر لے، لیکن سمجھے اس سے
 چڑ ہو گئی۔ پھر بھی میں نے سمجھے کچھ نہ کہا۔ چھبیس برس کی عمر تک
 سمجھے گھر رکھا اور روٹیاں کھلاتا رہا۔ ہوتا کسی باہر کے ملک
 میں تو اٹھاروں پھاندتے ہی باپ تیرے چوتھے پر لات مارتا
 اور باہر نکال دیتا۔ یہ اپنا ہی ملک ہے۔ جس میں اس قسم کی
 چوتھا پنتھی چلتی ہے۔ سبب تیری صیب میں پیسے نہیں ہوتے
 سمجھے تو میں تیری ماں کی پوری سے دس بیس پچاس ڈال دیتا تھا،

اور آج یہ اسی کا کارن ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہے اور
 کہتی ہے کہ میں نے اپنی اولاد کو تباہ کر دیا۔ تیری وجہ سے میں
 نے اپنی زندگی برباد کر لی۔ یہ نیرا ہی فقرہ ہے تاکہ میری ماں جس
 قسم کی عورت ہے اس سے تو میرا باپ کوئی واسطہ رکھ سکتا ہے
 کہنا نہیں تو نے؟ جو بیٹیاں کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے وہ
 باپ کی بابت کیا کہے گا؟ روز تو ماں کو گالی دیتا ہوا نکل جاتا ہے
 اور جانتا ہے وہ گالی کسے پڑتی ہے؟ وہ تجھے گالی دیتی ہے تو
 گالی کسے پڑتی ہے؟ کیا اس گھر میں کوئی مالک نہیں، کوئی باپ
 نہیں، کیا ہوا جو ایک بار زندگی میں صرف ایک بار گھٹا پڑ گیا۔
 میں نے لاکھ روپیہ گنوا یا ہے تو آج ہی لاکھ روپے کا کاسٹریٹ
 کیا ہے جس میں سے کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار بیچ جائیں گے۔
 جب تو تیری ماں بھی خوش ہوگی اور یہ لاڈ بھی جو اس دن
 باپ کی بجائے مجھے انکل کہہ گئی، اور تو بھی خوش ہوگا اور فخر
 سے میرا نام لے گا، میرے پاس ہو ہو کر بیٹھے گا اور باتیں کرنے
 کی کوشش کرے گا۔ لیکن میں تم سب کو سمجھ گیا ہوں، منہ نہ
 لگاؤں گا کسی کو۔

پال کے ہونٹ بھر کسے لگے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا بھی

توصاف اتنا: ”پرپیا، میں نے کیا کیا ہے؟“
 ”تم نے؟“ سنت رام اور بھی بند آواز سے چیخا: ”تم نے
 مجھے گالی دی ہے جو کسی نے نہیں دی، کسی کی ہمت ہی نہیں
 پڑی، سب جانتے ہیں میں خالی ہاتھوں سے ان کی بوٹیاں اڑا
 دوں گا، تیری یہ ہمت کہ ایک سگریٹ تیرا پی جانے سے تو پورا
 سیکٹ میرے منہ پر دے مارے؟“

و ایک سگریٹ؟“ پال نے کہا۔
 ”ہاں،“ سنت رام نے کہا، ”مجھے پنا چل گیا ناس نے تیرا
 ایک اسٹیٹ ایکسپریس صبح پی لیا تھا۔“
 ”نہیں، مجھے نہیں معلوم۔“

اس سے پہلے کہ سنت رام، جو کانپ رہا تھا، نیچے گر جاتا۔
 بیٹے نے بڑھ کر تھام لیا اور اٹھا کر اسے اندر کے بیڈ روم میں
 پینک پر ڈال دیا جیسی بابی اپنا بالنس لیتے چلا آیا اور آتے ہی
 اس نے پال کو جڑوں اور بولہ: ”تم پرپیا کو مالا، ہم تم کو مالے گا“

اگلے روز سنت رام حسب معمول صبح کے چار بجے اٹھ گیا
 تھا۔ اسے پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دھو بن کوٹو سٹرب کٹے

بغیر وہ ساتھ کے کمرے میں چلا آیا جہاں پال، لاڈو اور اس
 کا بچہ بابی سوئے تھے۔ سنت رام نے زبردیا اور کابلدب جلایا
 اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی، مدھم سی روشنی میں وہ کتنے
 حسین لگے رہے تھے۔ ایک سے ایک خوبصورت اور خوشبو دار
 آج بابی کی بانہہ ماں لکے گلے میں نہ تھی، وہ آزاد اور بے فکر
 سو رہا تھا۔ سنت رام نے سوچا۔ کالج بھیجنے سے پہلے میں نے اس بچی
 کو یکسر دریافت کیا، لیکن اگر یہ کوئی بے راہ روی کرتی تو کیا میں اسے
 شرم پر پھینک دیتا؟ پال کا تجربہ ناکام ہونا تو میں اسے
 زندگی کا کھیل نہ سکھاتا؟ یہ اخلاق، یہ تہذیب — سب باتیں
 ہیں۔ یہ اور یہاں سے باہر کے سب بچے ہیں جو کھیلتے ہیں، گرتے
 ہیں اور پھر اٹھ کر کھیلتے لگتے ہیں۔ دھوون، دھوون بے وقوف
 ہے، وہ نہیں جانتی کچھ بھی، سوائے کپڑے دھونے کے۔
 سنت رام نے اسٹیٹ ایکسپریس کا کارٹن نکالا اور اسے
 بیٹے کے سر ہانے رکھ دیا۔ رات اس جھگڑے کی وجہ سے وہ
 اسے بیٹے کو دے ہی نہ سکا تھا۔ پلو، یہ اور بھی اچھا ہوا، جاگے
 گا تو ایک دم پورا کارٹن پا کر وہ کتنا خوش ہو گا۔ پھر سنت رام
 بیٹے کے ویسے ہوئے ریشم سو براہین کا پیکیٹ ڈھونڈنے لگا۔

پکیٹ وہیں پڑا ہوا تھا جہاں وہ رات کو گرا تھا۔ سنت رام نے اسے اٹھایا اور اس سے پیار کیا، پھر اس میں سے سگریٹ نکالا اور جلایا اور دھوئیں کے بڑے بڑے کش چھوڑے۔ زیمرو پاؤں کے بلب کی روشنی پہلے ہی کچھ نہیں ہوتی، اس پر دھوئیں نے اور بھی منظر کو دھندلا دیا۔ بچے فرشتوں سے بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہے تھے۔ سنت رام کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر پال کے گھنے بالوں میں پیار سے ماتھہ پھیرے، اس کا منہ چوڑے۔ لیکن کہتے ہیں: سوتے میں بچے کا منہ نہیں چومنے جانے کیوں؟ اس وقت تو سنت رام نے یہی سوچا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جاگ جائیں گے۔

سو براتن کے چوتھے کش میں کوئی نشہ تھا یا شاید ایسے ہی سنت رام کی آنکھیں میٹھے کی شراب سے چڑھ گئی تھیں۔ اس نے دھواں صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر پراگھنا کے لئے پوچھا کہ کمرے کی طرف چل دیا۔

سرب دیال

یاں بھتی مجھے ہی پہاڑی کو کہتے ہیں۔

میرا اصلی نام سرب دیال ہے، یعنی سب پہ چربان، اور میرے
 والد کا نام دیوی دیال، یعنی جو دیوی پہ چربان ہو یا یوں کہ جن پہ
 دیوی چربان ہو۔ میرے والد کبھی ی ی ی کے سورگباش ہو
 چکے۔ ہر کسی کے تھوڑے بیٹھ رہتے ہیں۔ جیسے آپ کے چل دیئے
 دیئے میرے بھی چل دیئے۔ میں ذات کا کھتری ہوں اور میری گوت
 سرنہ ہے، لیکن میں عام طور پر اپنے نام کے پیچھے کوئل لکھ لیتا ہوں
 ہاں، جس کی کوئی گوت نہ ہو یا وہ اپنی گوت نہ جانتا ہو اور باپھر
 اسے اپنی گوت نہایت لغو معلوم ہو وہ بے کھٹکے اپنے نام کے
 پیچھے یہ دم لگا سکتا ہے اور پھر اسے مر سکتا ہے، اور کہیں زیادہ
 غصے میں آئے تو مہا بیزجی کی طرح اس دم میں آگ لگا کر کسی کی
 بھی لٹکا مچھڑک سکتا ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں مجھے اپنا نام برتنے کی کبھی ضرورت

ہی نہیں پڑی۔ آج سے پینتالیس سال پہلے، گاؤں کے مدرسے
 میں داخل ہونے سمے، میرے باپ نے میرا اصلی نام لکھوایا تھا۔
 لیکن وہاں بھی کیفیت کے خانے میں ستم ظریف مدرس نے میرا
 مروجہ نام لکھ دیا۔ بہر حال، مجھے کوئی افسوس نہیں۔ اس کے دس
 سال بعد میٹرک کی سند پر اپنا نام سرب ویال کوشل ویکھ کر مجھے
 خود ہی اچنبھا ہوا۔ اپنے نام کے بارے میں کوئی حیران نہیں ہوتا،
 بلکہ کوئی اس کے بارے میں غور ہی نہیں کرتا، لیکن میں صاف
 بات کہتا ہوں۔ مجھے اپنا نام دیکھ کر ضرور حیرانی ہوئی اور خوشی
 بھی۔ میرے جی نے کہا، ویال چاہے کچھ ہی کہے، لیکن یہاں میرا
 نام پکا ہو گیا ہے۔ ایک نیم سرکاری سند میں اس بات کو مانا گیا
 ہے کہ سرب ویال کوشل، جو دیوبند دیال سرنا کا بیٹا ہے، ۸ ستمبر
 ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوا اور اس نے پنجاب یونیورسٹی سے دوسرے
 ڈویژن میں انٹرنل پاس کی۔

اب میں جس کے سامنے وہ سند رکھنا چوں وہ فوراً مان
 جاتا ہے کہ یہی سرب ویال ہے۔ ہماری اس ویال میں کوئی کسی
 کی بات نہیں مانتا تا وقتیکہ اسے لکھ کے یقین نہ دلایا جائے اور
 جب کہ کوئی چیز لکھ کے اس کے سامنے پیش کر دی جائے تو وہ

اتنی جلدی تسلیم کر لیتا ہے کہ سارا سلسلہ ہی فحش معلوم ہونے لگتا ہے۔
 آپ چلاتے جاتیے کہ آپ سرب دیال ہیں، سرب دیال ہیں۔
 سرب دیال ہیں لیکن وہ نہیں مانے گا، آپ کی بات کو کسی کوے
 کی کاہن سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا، لیکن جب...

میں پہاڑ کا رہنے والا ہوں، پہاڑ میری زندگی کا جزو ہے۔
 میں بائیس سال کے عرصے سے ادھر میدانوں میں ہوں لیکن پہاڑ
 مجھے وہ بات نہیں ملتی جو پہاڑ میں ملتی ہے جہاں کبھی آپ اپنی
 نگہبانی سنبھال کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی کیکچی لے
 کو نیچے زمین کی طرف پہاڑوں میں آپ کو عجیب طرح نغمگی
 ملتی ہے جس میں اُو اسی اور کاہش زیادہ ہوتی ہے ایک پہاڑ
 سے دوسرے تک آواز پہنچ جاتی ہے لیکن آوجی نہیں پہنچ سکتا
 درمیان میں کوئی گہری کھاکی یا نالہ والا آجاتا ہے جسے پار کرنا
 ناممکن ہوتا ہے چنانچہ پیار کی لڑکی موہن جھولا کے لڑکے کو
 پکارتی ہے تو ہمیشہ یہی کہتی ہے: چند اکہاں ملاں، جندے کتھے
 ملاں چاند! (بچھے) کیسے ملوں، جال! کہاں ملوں؟ اور لڑکے کا جواب
 میں کہتا ہے: چاندنی، کوئی دن ٹھہرا ب کے میری بکریوں کے
 بال اتنے لمبے آگے ہیں کہ وہ چلتی ہیں تو پیروں میں انگ

جاتے ہیں میں ان بالوں کو کاٹ کے رسہ بناؤں گا۔ اتنا لمبا،
 رسہ جو دنیا کے ایک سرے کو دوسرے سے ملا دے گا۔ وور،
 نیچے کھڑے کنارے آؤ اس کا ایک سرا میں تیری طرف پھینکوں
 گا جسے تو اوپر لے جانا اور دشتِ مند کے ستون سے
 باندھ دینا۔ وہ ستون جس کے اوپر بڑے بڑے چمکاوڑ لٹکے ہوتے
 ہیں۔ دوسرے سرے کو میں اپنے ڈھارے کے پیل سے باندھ
 دوں گا کیوں کہ اس پیل نے پیار کرنے والوں کی ہمیشہ مدد کی
 ہے اور جب چچا، ناؤ، ساموں اور گاؤں کا منبر دار اٹھا کر
 میہان سنگھ، اس محبت کو تیوروں سے دیکھتے ہیں ہمارا
 یہ پیل اپنے پتوں سے تالیاں بجاتا ہے۔ بس، ایسے ہی اسد اس
 کی ایک رات کو اس دے پہ ہاتھ چھیبتا ہوا میں بترے پاس
 چلا آؤں گا۔

اور اس کے بعد چند رات کی تعریف میں جٹ جاتا ہے :
 دن اچھا نہیں ہوتا۔ رات کتنی اچھی ہوتی ہے۔ پیار کرنے والوں
 کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ
 لیٹے ہوئے ایک دوسرے کے جسم کو ٹٹولتے ہیں گویا یہ بھی کوئی
 میٹرھی ہے جس کی مدد سے وہ کوئی دوحانی منزل طے کر رہے

ہوں۔ اڑ، ہنڈ اور برہمانڈ کی خبر لائیں۔

اور سارے گیت ہیں دہو، دہو، دہو، کی ایک مسلسل آواز ہوتی ہے جو گونجتی ہی چلی جاتی ہے۔ جو نہ صرف دادلوں کے نشیب کو پاٹ دیتی ہے بلکہ دلوں کے تمام کونے کھدے بھر دیتی ہے۔ ارمانوں کے وہ ستون، جن پر خیالات کے چمکاؤں لٹکتے رہتے ہیں ایک نار کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہے اور چمکی و بکی محبت چلی آتی ہے۔ جب گھنٹیاں بجنے لگی ہیں، ایک ایسی شہنائی کی آواز آتی ہے جو کسی اتصال پہ نہیں آتی، ایک ایسی آہنی ہے جو کبھی نہیں اُترتی۔ کل ہی مجھے کسی نے کہا تھا، ”یہ پہاڑی لڑکیاں اس لڑکے ہی سے کیوں پیار کرتی ہیں جو سامنے کے پہاڑ پہ رہتا ہے اور جس کا ملنا بے حد مشکل ہے۔“ تو میں نے کہا تھا: اول تو انسان آسمان کو تنہا لگانا ہی پسند کرتا ہے اور اسے اسی پیار میں مٹھاس ملتی ہے جو ہاتھ لپسارتے ہی نہ مل جائے اور دوسرے پہ ایک تلامذہ ہے۔ ایک ہی گاؤں کا لڑکا اور لڑکی آپس میں پیار کرنے بھی لگیں تو لڑکے کا تلاش، معاش میں کہیں دور چلا جاتا ہے کیوں کہ ہمارے پہاڑوں میں بھٹوں اور دھان کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ غرضیکہ پھر اور چٹانیں ان فی محنت کا سر بھوڑتی ہیں۔ جہاں کہیں

زمین ٹھک مار کے لیٹ جاتی ہے۔ ایک بڑے محذوش سے دردِ نہ کے ساتھ چند چیزیں اُگا دیتی ہے۔ مثلاً جیسے ہمارے یہاں کھٹے انار اُگتے ہیں جو میدانوں میں رہنے والے لوگوں کے سانس کا ذائقہ بڑھاتے ہیں۔

گویا پہاڑوں میں پیارا کر نے والے ایک دوسرے سے جدا ہی رہتے ہیں۔ یہی متمیں اپنی مصیبت کا کیا بناؤں؟ ہماری عورتوں کے پیٹ میں بچے کسی کے اور دل میں پیار کسی کا ہوتا ہے۔

تم نے ہمیں اپنے وطن میں نہیں دیکھا، کم سے کم سخت سردی کے دنوں میں نہیں دیکھا جب ایسا معلوم ہوتا ہے ہم نے جرات کی منہ سے نکل کر جم گئی اور جب براہِ کاردی اس کا جواب دینا ہے تو یوں نظر آتا ہے جیسے اس نے ہماری باتوں کی برف کو پکڑ کر رکھ لیا اور اب فرصت سے بیٹھا اسے توڑے پہ بگھلا کے سن رہا ہے اور ہوسے ہوسے اس کا جواب دے رہا ہے۔

بھاگن اور چیت میں ہم سب اپنے اپنے ڈیروں میں چکے دیکے پڑے رہتے ہیں۔ سامنے آگ جلتی رہتی ہے جو آتشِ برنوں کی ہاگ کی طرح کبھی سرد نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی ہاتھ بڑھا کر آگ میں ایک چلی ڈال دیتا ہے اور پھر وہ محسوس کرتا ہے

اس کا آگ گرم ہے لیکن پیچھا بدستور سچ۔ ایک ہی بدن میں گرمی اور سردی کی کش مکش اسے کاش تم نے دیکھی ہوتی اور پھر سردیوں کی آگ بھی کیا چیز ہے! کوئی قریب آئے تو جل جائے۔ ددرہٹے تو جھج جائے۔ ہماری کیفیت ان ڈرے ہوئے بچوں کی سی ہوتی ہے جو کسی نامعلوم دیو کے خوف سے گھبرا کر اچانک ماتھوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ صرف منہ ان کا باقی کھلا ہوا جسم روح سرد کر دینے والے خوف سے سہما رہتا ہے۔

اور ہم بیٹھے پہروں آگ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ درمیان میں عورتیں ہمیں موٹا اور لال لال بھات کھانے کو دیتی ہیں جو ہمارے چہرے پر نمازت اور بدن میں ایک جان سی لے آتا ہے، جو جسم کی گرمی کو صرف ہونے سے بچانا ہے، پیٹ کے ٹھنڈے ہوتے ہوئے چوبیس کے لئے ایندھن کا کام دیتا ہے کھاتے کھاتے ہمارے انگلیاں سرد گرم ہو جاتی ہیں کہیں پیچھے سے ”اوتی مری گئی“ کی آواز آتی ہے اور ہم تھکے مڑ کے نہیں دیکھتے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ باہر سے کوئی البیلا آتا ہے۔ پہلے تو ماتھہ گڑ گڑ کے گرم کرتا ہے، پھر ماتھوں کو مٹھی کی شکل بنا کر اس میں گرم گرم ماسنس کی دھونکنی چلاتا

ہے اور جب وہ اس پر بھی گرم نہیں ہوتے تو وہ الگنی
کے نیچے پڑی ہوئی اپنی محبوب بیوی کے کرتے میں داخل
کر دیتا ہے۔ وہ ہلکا سا شور مچاتی ہے اور پھر خود ہی
اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیتی ہے، اپنے کرتے میں بھیختی
ہے اور پھر ایک معنی خیز خاموشی چھا جاتی ہے۔

مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب کھانے کے لئے کچھ نہیں
رہتا۔ پہاڑ کی تقریباً ساری مٹی بیرنگا لے کے لئے سولن کی بریڈ
میں بھیج دی جاتی ہے اور جو تھوڑی بہت بچ جاتی ہے وہ سب
کے لئے ناکافی ہوتی ہے اس وقت لوگ محض توت ارادی کے
بل پر باہر نکلتے ہیں اور ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہیں اور ان کی
نگاہ ہائیڈرو ایکٹرک کے بڑے بڑے کھمبوں اور تاروں پر
جا گنتی ہے جو پہاڑی بستریوں پر سے گزر جاتے ہیں اور ان تاروں
پر کہیں کوئی پیالہ یا کوئی بیٹھانے کے انداز میں غائب غائب کرتا
ہے اور نیچے سنسان دادی میں اس کی خوفناک آواز گونج جاتی
ہے۔ پھر کہیں کھمبے پر لکھا ہوتا ہے :
خطرہ :۔۔۔۔۔ اولٹ۔

اور اس کے نیچے ایک انسانی کھوپڑی کی تصویر ہوتی ہے اور ہڈیوں کا ایک کمر اس اور پھر وہی کورے کی غائب غائب۔ اس کے بعد میدانوں میں بھاگی جانے کو جی چاہتا ہے۔

ایسی ہی ایک سردی، ایسی ہی ایک بے کاری اور مفلوک الحالی سے گھبرا کر میں نے میدانوں کا رخ کیا۔ جب میری ستونتی ماں میری رانی ماں مرحلہ ٹھنی اور تم تو جانتے ہو ماں کے سوا کسی کو رونا نہیں آتا۔ باپ تھا گھٹے کا مارا ہوا، دیوبی دیال۔ اٹھنے کی ایک مفلوک کوشش میں تین بار اس کا صاف کھلا۔ تینوں بار اس نے ناشائستہ، نازبیا اور جھڑے طریقے سے اسے پیٹ لیا، پھر میرا وہ حجم دانا اپنی رعشہ دار آنکھوں سے کچھ کہنے، کچھ سمجھنے لگا۔ اپنی چکٹ آستین لے اس نے آنکھوں کا میل پونچھا اور رکیک سی ناک پونچھی اور کہنے لگا: جا... جا بیٹے... جا اسی راستے جس راستے سب گئے۔ اس کے علاوہ گھر میں بھائی تھا، بھائی تھی اور ان کا ایک بچہ تھا۔ شروع میں انہوں نے میرے جانے کی مخالفت نہ کی شاید اس خیال سے کہ بھی جاتے ہیں لیکن جب میں چلنے لگا تو میرے بھائی کو پنا چلا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ جیسی اس کے بازو اکڑ گئے اور میٹھی زبان اور میٹھی بولی دانی میری بھائی کا دل یوں کانپنے لگا جیسے

پیٹھے کی مٹھاتی پر لگا ہوا سونے کا ورق کا پتلا ہے۔ اس سے کچھ
 نرین پڑی تو اس نے میرے ہتھکے کو آگے کر دیا وہ میرا بھتیجا۔
 جس کی اس کے باپ نے پروانہ کی، جسے میں نے پالا اور دفور
 محبت میں جسے میں نے اس کے اپنے ہی باپ کو گالیاں دینا
 سکھائیں۔ اس نے بازو میری طرف پھیلا دیا۔ میں نے زندگی
 میں بڑی پرکھشا دیکھی ہے پر ایسی نہ دیکھی تھی۔ جہاں سب کے
 من ڈل رہے تھے وہاں اس بچے کا من سٹھرا تھا، جیسے کہہ رہا
 ہو: ”دیکھو تو کیسے جاتا ہے“ اور میں بس چلا آیا۔

راستے میں چٹافوں نے روکا، چٹڑھوں نے ٹوکا، بھٹے برف
 کے سمور دستجاب میں سے گرد میں نکالے مجھے جانے سے منع کر رہے
 تھے۔ پھر کہیں در سے آواز آئی جس کے مشکوں کی تھھر تھراہٹ
 نے ٹنڈ ٹنڈ پیڑوں پر سے ہرنب گرا دیں، سامنے ایک دھندلی
 پھیلی ہوئی تھی۔ میں جا رہا تھا اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا۔
 جیسے فنا کا مسافر خلود کی دھندلی بستیوں میں داخل ہو رہا ہے اور
 وہ آواز اس کی رہنمائی کر رہی ہے، کبھی روکتی ہے، کبھی چل دینے
 کو کہتی ہے، راستہ بتاتی ہے۔ راستہ گم کر دیتی ہے۔
 وہ آواز سامنے پاڑ پر سے آ رہی تھی۔ وہ تھی دنی کی آواز

جس سے میں نے اپنے جانے کا راز چھپا رکھا تھا لیکن جو سب
 کچھ جان گئی تھی، میں اس سے پیار کرتا تھا اور اسے پی پی کہا
 کرتا تھا۔ کیوں کہ اس کی آواز بڑی تلی تھی، بالکل ایسی تھی جیسی
 ہم پیل کے پتوں کی سیٹی سے نکالا کرتے تھے۔ وہ گامہ ہی تھی۔
 ایک مشہور پہاڑی گیت :

اساں تری جانا، ہوا ساں تری جانا

ہم چلے جائیں گے، مارے، ہم چھپے جائیں گے۔ اور مجھے یوں
 معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا وقت آچکا ہے۔ میں ہونٹوں سے بے
 مروقی کی سیٹیاں بجانا ہوا ان بلند یوں سے اترتا اور ان سیٹیوں
 میں چلے آنے میں شاید ایک پہ جذبہ بھی تھا: میں بہت حاکموں
 گا، بہت سا جمع کروں گا اور واپسی پر بھابی کو بند لوں گا۔
 پی پی کو مستحسنو سلواؤں گا اور باپ اور بھائی اور بھتیجے کو
 خیر چھوڑ دو۔ ان سب باتوں کے علاوہ میرا ایک یہ بھی مقصد تھا
 کہ پی پی سے نشاوی کروں گا، پیل کے امنی پتوں کی سیٹیاں بجاؤں
 گا۔ لیکن شہر کے مردنگ اتاروں نے ان نرم و نازک سیٹیوں کی آواز
 ڈبو دی۔ یہاں شہروں میں آدمی اکثر اتنا ہی کماتا ہے جس سے
 بمشکل اپنا ہی پیٹ بھر سکے۔ کسی حادثے ہو جاتے ہیں، کوئی ناگاہ

بیماری آجانی ہے کسی دوست پر مصیبت آن پڑتی ہے جس میں اس
 کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔ پھر اپنی چھوٹی موٹی کمزوریاں جن میں غیر جمائی
 جسمانی ملاپ بھی شامل ہے اور اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنے
 آپ کو دھوکا دینے کی بے پناہ طاقت رکھتے ہیں۔ کسی دوسری
 عورت کے ساتھ ہم آغوشیوں کے باوجود سمجھتے ہیں کہ ہم پیار
 اسی پی پی کو کرتے ہیں۔ گویا پی پی کی محبت کے جذبے میں مرشار
 کسی بھی لڑکی کو ایک بہانہ بنا لیتے ہیں اور یہ سلسلہ بڑا المناک ہوتا ہے
 واصل پوری آزادی کے بنا ہمیں اپنی محنتوں پر قدرت
 ہوتی ہے اور نہ نفرتوں پر اپنا بس چلتا ہے۔ ساری زندگی ایک
 کھیل سا معلوم ہوتی ہے، ایک گھٹیا سائنک جس میں کام کرنے والا
 اپنا پاسٹ بھولا دیتا ہے اور پس پردہ پرامیٹر کچھ ایسے طریقے
 سے پارٹ یا دولا تا ہے کہ سننے والوں کو اس کی آواز بھی سنائی دیتی
 ہے لیکن وہ ہیں کہ ایک ڈھٹائی کے ساتھ کھیل دیکھتے چلے جاتے
 ہیں۔ خیر یہ باتیں چھوڑیے۔ میں کبھی اتنی آمدنی ہی نہ پیدا کر سکا
 کہ گاؤں — نرنگ دا قشام سے گاؤں — لوٹ جاؤں اور
 اب تو پی پی کئی بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ کوئی اس کے بارے
 میں خاموش رہتا تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، لیکن ہر سال کوئی نہ

کوئی پہاڑوں سے مجھے ملنے آتا ہے تو جانے کیوں مجھے ہی اذیت
 دینے کے لئے یہ ضرور کہہ دیتا ہے ”وہ تمہیں پوچھ رہی تھی۔“
 اور میں کہتا ہوں۔ ”مجھے کیا ہے؟ مجھے کیا ہے؟ مجھے کیا ہے؟“
 ہاں، تو میں شہر کی بات کر رہا تھا شہر کی ٹریجڈی ان المناک
 داستانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان داستانوں میں زیادہ سے
 زیادہ یہ ہوتا ہے ناکہ کوئی مرجانا ہے، یہاں بھی فاقہ مستی اور
 ”تنگ دستی“ سے مجبور لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے
 اکثر ایسے ہوتے ہیں جو مرنے کے ارادے سے اپنے آپ کو
 بس کے سامنے گرا دیتے ہیں لیکن تقدیر کا پیہ کچھ یوں اُوپر سے گزرتا
 جاتا ہے کہ وہ مرتے نہیں۔ ان کی ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ بیان جو
 یہ کہہ دے۔ میرے پاس کام نہیں، وہ سب سے اچھا لیکن ان
 کا کیا کیجیے جو چھ گھنٹے انتظار کر داتے ہیں اور اس کے بعد ملنے
 ہیں تو کہتے ہیں اگلے مہینے کی انٹیس کہ ملتے وہ دس تاریخ نہیں کہتے
 پندرہ بیس نہیں کہتے، انٹیس کہتے ہیں اور آپ کو خیال آتا
 ہے کہ یہ جو طاق قسم کی تاریخ وہی ہے اس کا مطلب ہے کام
 ضرور ملے گا چنانچہ اس خیال سے آپ اپنی تھوڑی بہت پڑبکی
 شتم کر دیتے ہیں اور جب انٹیس تاریخ آتی ہے اور آپ ان

کے پاس جاتے ہیں تو پھر وہ اگلے مہینے کی سترہ تاریخ بتاتے ہیں۔ پھر وہی طاق کا عدد لیکن اب آپ کو اس جفت اور طاق کا حساب سمجھ میں آ جاتا ہے اور آپ اس سخت سی سیٹ پینیں بیٹھتے جو انہوں نے کمرے کے باہر انتظار کرنے والوں کے لئے بنا رکھی ہے اور جس کے نیچے انہوں نے نایل، سمبل یا اسپرنگ کے بجائے پتھر بھر رکھے ہیں اور آپ کی روح کلبلاتی ہے۔ جب آپ دیکھتے ہیں یہ سلوک آپ ہی سے نہیں ہونا عودت سے بھی ہوتا ہے جو گھر کی زمین بتنے کے بجائے دفتر کی ٹپ ٹپ ہو جانا گوارا کر لیتی ہے اسے بھی ایسا ہی جواب ملتا ہے اور جب وہ یالوس ہو کر ٹوٹتی ہے تو چھپے سے کھلی کی آواز آتی ہے اور وہ سنتی ہے کوئی کہہ رہا ہے۔

”کیا بے ہودہ ہے۔“

”سال دو سال پہلے آتی تو معاملہ جتنا۔“

اور پھر کوئی دوسرا مداخلت کو تار۔ ”میں اسے جانتا ہوں چلتی ہے۔ چٹھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھو، جو کبھی انکار کر دے تو کھڑے کھڑے چناب سے موٹھیں منڈوا دوں۔“

اور وہی عودت پھر حیل کی طرح پر مھیلیاں، چلاتی شہر کے

بو حیر خالوں پہ منڈلاتی ہے، حویلیوں کے منڈ پر پڑتی ہے، پھر
 اُٹھتی ہے، پھر انسانی چوہوں پر جھپٹتی ہے، انہیں دبوچ کے لے
 جاتی ہے اور آخر قدر زائد کے سمجھنے پر دم توڑ دیتی ہے۔
 چیل سے مجھے یاد آیا۔ میں شہر پہنچا تو لوگوں نے مجھے پہاڑی
 کو اکھنا شروع کر دیا۔ اس کی تین دھبیں تھیں۔ آخری دھبی تو
 آخر میں بتا دوں گا، پہلی دس لیجئے۔ شہر میں آتے تھے مجھے پٹرول
 کی شکایت تھی۔ یہ بیماری پہاڑوں میں عام ہوتی ہے۔ پہاڑ کے پانی
 میں جہاں دوسری معدنی چیزیں ہوتی ہیں وہاں ایکوڈین کی کمی
 ہوتی ہے جس کے کاربن گلاسوج جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں
 جب میں یہاں آیا تو میرے گلے سے غایت غایت کی آواز کے
 سوا کچھ نہ نکل سکا۔ لوگوں کو اپنے آپ ہی میرے نام کا پتا چل گیا
 اور انہوں نے مجھے پہاڑی کو اکھنا شروع کر دیا۔ میں پہلے تھوڑا
 ہنسنا، پھر میں نے کہا ”یار، دراصل میرا نام ہی یہی ہے، اس
 پر وہ بھی ہنسنے لگے۔ اس وقت جب میں نے خوف ہی اس بات کو تسلیم
 کر لیا تھا تو میرا خیال تھا یہ لوگ مجھے اس نام سے یاد نہیں کریں
 گے، وہ مجھے سرب دبال کوشل ہی کہیں گے، لیکن کچھ دن چپ
 رہنے کے بعد انہوں نے مجھے میرے پہاڑی کو سے کے نام ہی سے

پکارنا شروع کر دیا اور میں اسی پہ شا کہہ ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شہر کے لوگ مجھ سے جلتے تھے۔ اتنے بڑے شہر میں پہاڑ سے چلے آنے والے ایک آدمی سے کیا فرق پڑتا تھا؟ لیکن جانے کیوں وہاں کے لوگوں کو یہ اچھا نہ لگا کہ میں ان کی کمائی میں حصہ ہاؤں انہوں نے میری حیثیت وہی سمجھی جو پہاڑی کو سے کی ہوتی ہے جب وہ اپنے ماں کی سخت سردی سے گھبرا کر میدانوں میں چلا آتا ہے اور وہاں کی گرم، تیز اور بیانی ہوتی زمین سے دٹے ٹھونگ کر بڑی تسلی سے غائب غائب کیا کرتا ہے۔

شہر آکر میں رتن چند کے تالاب پر رہنے لگا۔ یہ تالاب بھی ایک طرح سے کوشل گدڑ تھا، یعنی جس کو رہنے کے لئے جگہ نہ ملے وہ رتن چند کے تالاب پر چلا آئے شہر کے تانگے والے سب جاتے تھے یہ تالاب شاہ عالمی دروازے کے باہر واقع ہے اور سرکلر روڈ پر ان کی معمول کی گندہ گاہ پر بٹہ تاجے گھوڑے تک اس نام کو جانتے تھے۔ اسٹیشن سے باہر آنے والا مسافر ہلکا سا بھی اشارہ کرتا تو تانگے والے گھوڑے کی باگ کھینچ کر چھوڑ دیتے اور انہیں وہ فقرہ ”چل اوتے ماں دیا دینیاں“ بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی، گھوڑا اپنے ڈھیلے ڈھالے اور ٹوٹے پھوٹے سارے میں

یوں مزے سے چلتا جیسے تھیل کا چپراسی اپنے کڈھب اور ان گھڑ
 لباس میں چلتا ہے کہیں موچی دروازے کے شروعات اور ہڈیوں
 روڈ کے آخر میں گھوڑے کی پیٹی ٹوٹ جاتے جس جگہ تانگے والا
 اپنا صافہ باندھ دیتا اور یا پھر اس کی کلغی گر جاتے جسے کوپڑا
 کو مھاگ کے لانا پڑتا۔ وہیں سے ایک راستہ بل روڈ کی طرف نکلتا
 تھا جس کے کنارے پر چارہ کاٹنے کی مشین یا سوکھی گھاس ملتی تھی۔
 تانگے والے دھان سے ایک بوری چارے کی ضرورت خریدتے اور
 سواریوں کو بے آرام کرتے ہوئے بوری کو میٹروں کے نیچے گھسیٹ
 دیتے اور پھر ”ٹا... ٹا... جش“ کہتے ہوئے چل دیتے۔ شدہ
 شدہ تانگہ بدن چند کے تالاب پر پہنچتا جہاں تانگے والے کچھ دیر
 رک کر سلفے کا کش دگاتے اور پھر چل اوتے موری چل اوتے
 بھاٹی کہتے ہوئے۔ اگے چلے جاتے۔

اور ہمارا مسافر تالاب پر اتر جاتا۔ یہ تالاب کوئی پون سو گز
 لمبا اور آدھ سو گز چوڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف مغلیہ قسم
 کی بارہ وری کے انداز میں چوبوترے بنے تھے جن پر ان گنت
 مستون گھڑے تھے۔ بے رحم نابالغ ہاتھوں نے ان پر نام کڈ
 کر رکھے تھے کہیں کہیں ٹش لٹو بیڑی بنی تھیں۔ جانے کب سے

یہ سنتوں ٹوٹی پھوٹی چھتوں کو تھامے کھڑے تھے۔ چونکہ سامنے
 اور بغل کی سڑک پہ بے شمار آمد و رفت تھی اس لئے راستے پر
 کی مٹی سے چھت پہ ایک خاصی تہ جم گئی تھی نیچے چوڑیوں پہ
 رہنے والے تو صفائی کی لاج رکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن چھت کو
 گندہ رہنے کی آزادی تھی اور اس پہ ایک بے نام سی گھاس اگ
 آئی تھی جو اپنے آپ سڑ جاتی اور جب چھینا پڑتا تو پھر ایک دم
 ہری ہو جاتی یہ سارا کدو شہ موسم کا تھا یہی حالت چوڑیوں
 کے نیچے رہنے والوں کی تھی۔ کبھی انہیں چار پیسے کی آمدنی ہو
 جائے تو وہ برسات کے مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگتے کسی طرف
 سے آواز آکر ہی ہے۔ ”نب چلے لام رکھو رانی“ اور کوئی ایک ڈ
 پکار اٹھتا :

توبہ واحد ای ناں ناتار بناں

رہندی ناں ، یار بناں

لچے ، فنگے ، یار ، چور ، فقیر ، اپاہج سب باہر تالاب کے کنارے
 پڑ رہتے تھے۔ یہاں بھی چھوٹی اور بڑی ذاتیں تھیں۔ جو باہر
 عزیز تھے وہ باہر تالاب اور سڑک کے درمیان سوتے تھے اور
 ”سپاٹے“ انہیں رات بھر تنگ کیا کرتے۔ آتے اور اٹھادیتے

نہ نہ چھوڑتے اور اب ان کو رات میں دس بار جاگنے اور
 اسی بار سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ چار پیسے کمانے والے
 ب کے اندرونی احاطے میں سوتے تھے اور اس سے زیادہ
 طاعت والے اندر کوٹھریوں میں۔ ساری سرویاں اندر رہتے
 پھر گرمیوں میں کوٹھے پر چلے جاتے۔ ان لوگوں کو اکہن روز پر
 پانی میں جاتی تھی۔ یہ اپنی قسم کے رئیس تھے۔ آئندہ یہی مجسٹریٹوں
 اور باقاعدہ کچری کیا کرتے اور جیسی طبیعت چاہے فیصلہ
 نہ دیتے جو سب پر لاگو ہوتا۔ ان غلط یا سچ فیصلوں کا اتنا
 ختم کو ناپڑتا جتنا کسی سرکاری عدالت کے فیصلوں کا۔
 لمبے چوڑے بکھیڑوں، ڈانوں اور گونروں کے گنجلک نقوش
 اور دتا لاپ پر رہنے والے لوگوں کی ایک ہی ذات تھی۔
 یہی کوٹل گوت تھی ان کی — افلاس !

[illegible]